1

علمی و تحقیقی جریدہ

ششماہی

نور معرفت

اسلام آباد

محرم / جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ

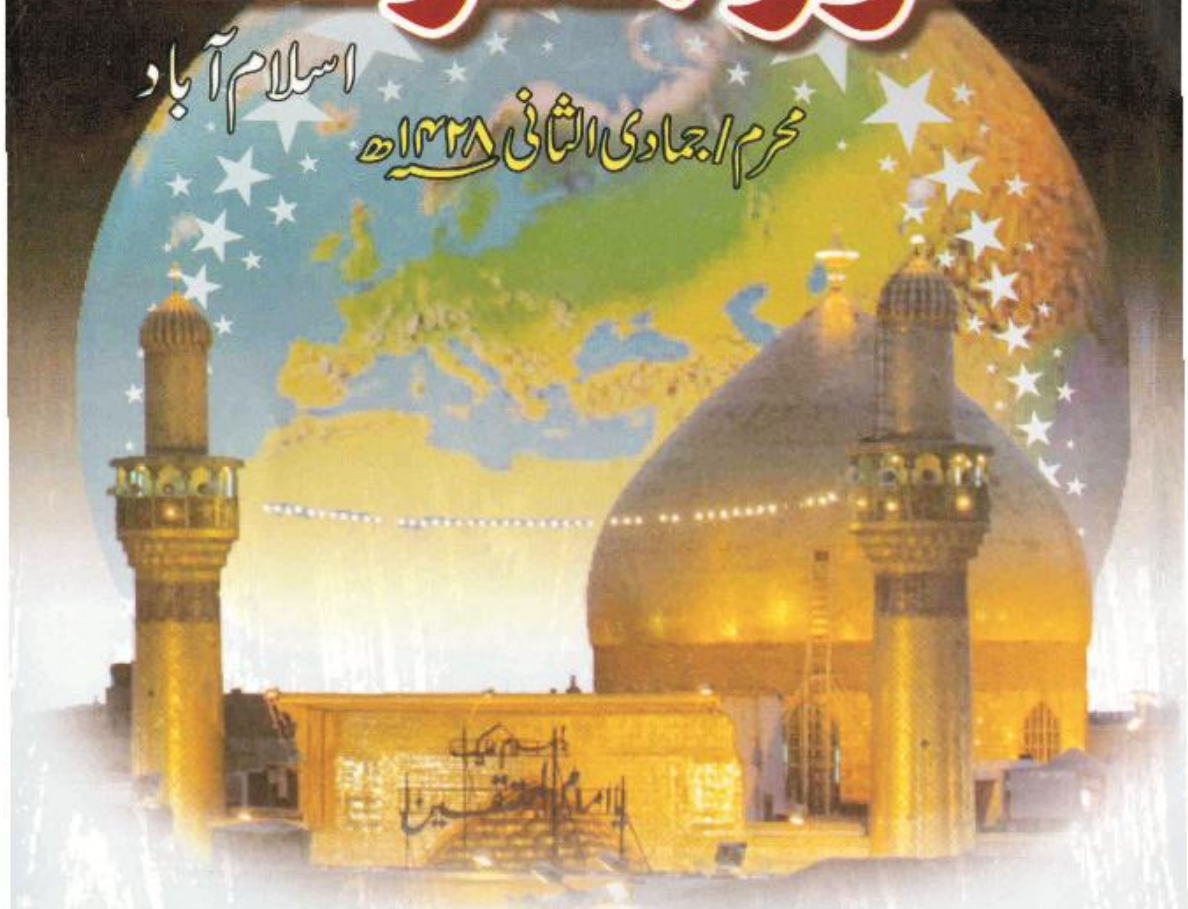

یکی از مطبوعات

نور الھدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) اسلام آباد

علمی وتحقیقی جریدہ

ششماہی **نور معرفت** اسلام آباد

جلد ۱ محرم/ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ شمارہ ۱

صرف ممبران کے لئے

مجلس ادارت

سید حسنین عباس گردیزی — سید ثمر علی نقوی

سید جعفر خوارزمی — محمد اصغر عسکری

سید فرحت علی کاظمی — جعفر علی میر

مجلس مشاورت

سید نثار علی ترمذی — ڈاکٹر حسنین نادر

اقرار حسین جعفری — ملک اعجاز حسین

پیشکش **مدیر**

جامعۃ الرضاؑ ، بہارہ کہو، اسلام آباد **سید رمیز الحسن موسوی**

نگران طباعت وسرکولیشن: سید محمد علی ترمذی

طابع وناشر :نور الھدیٰ ٹرسٹ اسلام آباد

اس شمارے میں

ابتدائیہ:	دینی مدارس میں دینی موضوعات پر تحقیق کی ضرورت	۳
مقالات:	امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ: حجت الاسلام غلام عباس رئیسی دام ظلّہ	۸
	شہادت امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ کی حکمت عملی: حجت الاسلام سید حسنین عباس گردیزی	۲۵
	کربلا میں صحابہ رسولؐ کا کردار: حجت الاسلام سید ثمر علی نقوی	۴۷
	اہل بیت علیہم السلام کی عزاداری: حجت الاسلام محمد اصغر عسکری	۸۱
	امام حسینؑ اور تقیہ: سید رمیز الحسن موسوی	۱۰۲
	عاشورہ حسینیؑ کے تناظر میں؛ متکامل انسان اور عورت کا کردار: حجت الاسلام سید جعفر خوارزمی	۱۳۴
	کربلا کی شعری روایت: سید نثار علی ترمذی	۱۵۳
	قیام کربلا اور حسینیؑ عزت: سید فرحت علی کاظمی	۱۷۲
کتابیات:	کتابیات امام حسینؑ: سید محمد علی ترمذی	۱۱۸۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

مدارس میں دینی موضوعات پر تحقیق کی ضرورت

مدارس اور حوزہ ہائے علمیہ اسلام کے وہ محکم قلعے ہیں کہ جن کے کمزور ہونے سے اسلام کے کمزور ہونے کا خطرہ ہے اور جن کے محکم و مستحکم ہونے سے اسلام کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں یہ وہ حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی صاحب عقل و دانش انکار نہیں کرسکتا۔ جس معاشرے میں دینی مدارس اور علمی مراکز نے اپنی ذمہ داریاں پوری کی ہیں اور اپنے مقصد کے لئے پوری دیانتداری کے ساتھ کام کیا ہے وہ ہمیشہ معاشرہ دینی اقدار کا علمبردار رہا ہے اور اس معاشرے میں احکام الٰہی کی حاکمیت کی برکت سے انسانوں نے پُر امن زندگی گذاری ہے لیکن جہاں بھی اِن مراکز نے اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتی ہے تو وہاں مسلمان معاشرہ انواع و اقسام کی آفات کا شکار ہوگیا ہے۔

یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب بھی آپ کسی مسلمان معاشرے میں انسانی قدروں کی پامالی، محروموں اور ناداروں کی فراوانی، گناہوں کی بہتات، نیکیوں کا فقدان، ظالموں وستم گروں کی حکمرانی، مکار و عیار سیاستدانوں کی بھرمار، جاہل و نادان افراد کا مسند علم وفتویٰ پر قبضہ، بیرونی استعمار کا تسلط اور اندرونی استبداد کی گرفت دیکھیں تو بغیر کسی غور وفکر کے جان لیں کہ اس معاشرے میں دینی مراکز اور اسلامی مدارس اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کر رہے ہیں اور علمائے دین علمی وشرعی ذمہ داریوں غافل ہو چکے ہیں۔

چونکہ دینی علماء اور اسلامی مراکز کی سب سے بڑی ذمہ داری اسلامی معاشرے کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ دینی احکام کی نشر واشاعت اور لوگوں کی زندگی کو اسلامی احکام کے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اسلام کے خلاف کھلنے والے ہر محاذ کا مقابلہ کرتے ہوئے اسلام کو قرآن اور سنت کے سرچشمہ سے لیکر بغیر کسی کمی بیشی کے آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا ہے اور اسلام میں ہر قسم کی بدعت کے دروازے بند کر کے اس الٰہی امانت کو تحریف وتبدل کے خطرات سے محفوظ رکھنا ہے۔ دینی

مدارس اور مراکز جہاں بیان کے ذریعے اسلام کی نشر واشاعت کے امین ہیں وہاں قلم کے ذریعے بھی اسلامی ورثے کو محفوظ رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ لہذا اسلام کو جدید چیلنجوں اور جدید سوالات اور شبہات کے مقابلے میں تر وتازہ رکھنا دینی مراکز اور علمائے دین کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ اس مقصد کے لئے اِن مراکز میں درس وتدریس کے ساتھ ساتھ اسلامی موضوعات میں تحقیق وتصنیف کا کام انتہائی ہی ضروری ہے۔ ہمارے اسلاف اور قدیم علماء نے جو علمی ورثہ ہمارے لئے چھوڑا ہے اور جن عظیم الشان علمی ذخیروں کے بل بوتے پر آج ہمارا دینی وعلمی تشخص قائم ہے، وہ انہی مدارس اور حوزہ ہائے علمیہ کے اندر درس وتدریس کرنے والے علماء کی دن رات کی محنت کا نتیجہ ہے جنہوں نے ناکافی وسائل کے باوجود عظیم الشان کتابیں تالیف کیں اور اسلام کے خلاف اُٹھنے والے ہر سوال کا علمی جواب دیا ہے اور کسی بھی دور میں معاندین کے شبہات کا جواب دینے سے پہلو تہی نہیں کی۔ آج دین اسلام کو سخت ترین سوالات اور شبہات کا سامنا ہے۔

ٹیکنالوجی اور علم وصنعت کے اس دور میں اگر علمائے دین جدید تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے فقط قدیم انداز میں درس وتدریس اور وعظ وبیان تک محدود رہے اور تحقیق وجستجو کا میدان خالی چھوڑ دیا تو بعید نہیں کہ اغیار اور دشمنان اسلام اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لئے اس میدان کو پُر کرنے کی کوشش کرنے لگیں گے جیسا کہ یہ کام کسی حد تک شروع ہو چکا ہے اور علم وعمل سے عاری نام نہاد محققین اور مستشرقین کی اسلامی تحقیقات سے متاثر اذہان دین کے بارے میں اظہار رائے کرنے لگے ہیں اور دینی علوم وفنون پر روشن خیالی اور جدیدیت کی آفات حملہ آور ہو چکی ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ سب کچھ فقط دینی مراکز اور اسلامی مدارس کی اپنی دینی وعلمی ذمہ داریوں سے غفلت اور غیر ضروری اُمور میں دلچسپی کا نتیجہ ہے۔

سالہا سال تک دقیق ترین اسلامی علوم وفنون میں سر کھپانے والے علمائے دین کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ معاشرے میں آکر کسی ادارے کے انتظامی اُمور سنبھالیں یا کسی پریس یا کتاب فروشی کے منتظم بن جائیں یا کسی سماجی وثقافتی تنظیم کے عہدے دار بن جائیں بلکہ اُن کی سب سے بڑی

مسئولیت دین اسلام کا علمی وفکری میدان میں دفاع ہے اور مسلمان معاشروں کو درپیش علمی وثقافتی مشکلات سے نکال کر اس دور کے مادہ پرستانہ علوم وفنون کے مقابلے میں علمی ومعنوی تقویت بخشنی ہے۔ آج دنیا ایک گلوبل ویلیج کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اسے اس صورت حال تک لانے والوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ اس دنیا پر اپنا مادی فلسفہ مسلط کر دیں اور خدا اور خدائی احکام کو گوشہ نشین کر کے مادیت اور مادی اقدار کو عام کر دیں؛ اُن کی مادی فکر کے نزدیک انسان کی سعادت یہی ہے کہ وہ اس دنیا کے تمام تر مادی لوازمات سے بہرہ مند ہو ورنہ وہ ایک ناکام انسان ہے ،اس لحاظ سے وہ اپنی دانست میں پوری دنیا کو سعادت مند بنانا چاہتے ہیں اور پوری دنیا کو ایک ثقافت اور تمدن کا پابند کر کے اپنے اس شیطانی فلسفے کو عملی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

جس کے لئے وہ ہر اس نظریئے اور فلسفے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں جو ان کے اس شیطانی فلسفے کے راستے میں رکاوٹ بن رہا ہے اور وہ فقط دینی فلسفہ اور فکر ہے جو اس دور کی مادیت کا سب سے بڑا حریف ہے۔اسلئے یہ جنگ مادیت کے علمبرداروں اور معنویت کے داعیوں کی جنگ ہے اور معنویت ومادیت کے مراکز ہی اس جنگ کے متقابل محاذ ہیں ۔لہذا دینی مدارس اور معنوی تعلیم وتربیت کے مراکز کی ذمہ داری اس لحاظ سے بہت ہی سنگین ہو جاتی ہے، اُنہیں جہاں مادی محاذ جنگ پر تن من دھن وارنے کی ضرورت ہے وہاں علمی ونظریاتی محاذ پر بھی چوکھی جنگ لڑنی ہے اور علمی ونظریاتی محاذ ہمارے مدارس اور علمی مراکز ہیں جن کو ہر قسم کے علمی اسلحہ سے لیس کرنا ان اداروں کے منتظمین کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

پس جو دینی مدرسہ علمی میدان میں اور نظریاتی محاذ پر پیچھے ہے اور اس دور کے جدید سوالات وشبہات کے مقابلے میں خاموش ہیں اور اس حوالے سے فکر مند نہیں دکھاتا تو وہ درحقیقت اپنی اصلی ذمہ داریوں سے غافل ہیں۔ ہمارے دینی مدارس میں اس وقت علمی وتحقیقی کام کی اشد ضرورت ہے اگر ہمارے مدارس کے ذمہ دار افراد کو اس ذمہ داری کی سنگینی کا احساس ہو جائے تو وہ دنیا کے سب کام چھوڑ کر علمی وتحقیقی کام میں لگ جائیں ۔البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دینی مدارس اور علمی مراکز

گوناں گوں مشکلات ومسائل کا شکار ہیں اوران میں سے جو دردمند اہل علم علمی میدان میں کام کی صلاحیت رکھتے ہیں اور تحقیقی وتخلیقی کام کرنے کے متمنی ہیں وہ ان مشکلات کی وجہ سے کچھ بھی نہیں کر پا رہے اور باوجود کوشش کے اجتماعی مشکلات اور ملکی حالات اور وقت ووسائل کی کمی اُنہیں کوئی قابل قدر کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی ،دینی مدارس کی بہت سی مشکلات ہیں جن کا تذکرہ فی الحال ہمارا موضوع سخن نہیں لیکن تحقیق وتخلیق کے حوالے سے ہمارے اکثر مدارس دینیہ کمی وسائل کا شکار ہیں اور تحقیق وتخلیق کے لئے لازمی وسائل سے محروم ہیں جس کی بڑی وجہ ملک میں دینی طبقات میں تحقیقی کاموں کی حوصلہ افزائی کا فقدان ہے اگر کوئی عالم دین اور مذہبی سکالر اپنی ذاتی دلچسپی اور کوشش کی بنا پر کوئی تحقیقی کام کرتا بھی ہے تو پہلے تو اسے منظر عام پر لانے کا مسئلہ ہوتا ہے اور اگر وہ اس میدان میں بھی اپنی ذاتی قربانی کے ذریعے کوئی تحقیقی تخلیق بازار علم وادب میں لے بھی آتا ہے تو اسکی وہ حوصلہ افزائی نہیں ہوتی جس کا وہ مستحق ہے اس کے برعکس عوامی نوعیت کے غیر تحقیقی اور قصے کہانیوں پر مبنی مواد کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔اسکی سب سے بڑی وجہ عوام میں علمی ذوق کی کمی اور ارباب اختیار کی جانب سے تحقیقی کاموں کی حوصلہ شکنی ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمیشہ علمی وتخلیقی کام حکومتوں اور ارباب اختیار کی توجہ کی وجہ سے فروغ پاتے ہیں جس کی مثالیں مسلمانوں خصوصاً برصغیر کی تاریخ میں فرواں ہیں کہ ارباب اقتدار اور علم دوست مسلمان حکمرانوں نے علمائے دین اور محققین سے کیسے کیسے علمی وتحقیقی کام کروائے ہیں اور سرکاری سرپرستی میں بہت سے علمی ادارے کام کرتے رہے ہیں،جن لوگوں کو مزید وضاحت چاہیے تو وہ حیدرآباد دکن کی علمی تاریخ اور حالیہ دور میں اسلامی جمہوری ایران میں ہونے والے علمی کاموں کو دیکھ لیں۔البتہ پاکستان میں دینی مدارس کے علمی زوال کا اہم ترین عنصر وسائل کی کمی ہی نہیں کچھ دوسری مشکلات بھی ہیں جن کو اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

اس وقت بلاتفریق مذہب وملت مسلمانوں کے تمام دینی مراکز میں تحقیقی کام کی طرف رجحان کا فقدان ہے اور مسلمانوں کا کوئی بھی مکتبہ فکر کوئی بھی تحقیقی تخلیقی کام پیش نہیں کرسکا خصوصاً اُردو

میں یہ کام بالکل فراموش ہو چکا ہے اور ہمارے دینی مدارس نے سوائے فرقہ ورانہ سوچ اور مواد تیار کرنے یا عوامی مزاج سے تعلق رکھنے والی ''پروڈکشن'' کے اور کوئی ذمہ داری ادا نہیں کی اور اسی کو دین کی خدمت سمجھ رکھا ہے۔آج ہمارے پڑھے لکھے طبقے میں بھی علمی کتب پڑھنے کا رجحان ختم ہو چکا ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بھی علمی نوعیت کی کتاب یا دینی وعلمی اصطلاحات پر مبنی مواد کو ہضم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔علمی رجحان کا یہ زوال ایک دن میں نہیں ہوا بلکہ یہ سب انحطاط ہمارے دینی مراکز کی تدریجی غفلت کا نتیجہ ہے جو مزید روبزوال ہے۔اسی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے نورالھدیٰ ٹرسٹ نے کہ جو ایک دینی ادارہ ہے اور دینی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے، دینی تحقیقات کے کام کا آغاز کرتے ہوئے اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود اس میدان میں قدم رکھا ہے اور تمام علم دوست اور دردمند اہل علم حضرات کو اس کام میں شامل کرنے کا عزم کرتے ہوئے ایک ششماہی تحقیقی جریدے کا آغاز کیا ہے۔اُمید ہے کہ ہمارا یہ کام علمی مراکز خصوصاً دینی مدارس کے لئے ایک تحرک کا باعث بنے گا اور دوسرے مدارس بھی اپنی اس عظیم ذمہ داری کی طرف متوجہ ہوں گے۔خصوصاً وہ مدارس ومراکز کہ جو وافر مادی وعلمی وسائل سے بہرہ مند ہیں۔

☆☆☆☆☆

امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کے قیام کا فلسفہ

حجت الاسلام غلام عباس رئیسی دام ظلّہ

حضرات ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت اور عملی زندگی میں بہت زیادہ مشترکات نظر آتے ہیں اور یہ ایک مسلم بات ہے۔ بقول اقبال

؎ حقیقت ابدی ہے مقام شبیری بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی

اس اشتراکِ فکر وعمل کی اصل وجہ یہ ہے کہ ائمہ معصومینؑ اور انبیاء الٰہی کا مقصد اور اصول ایک ہے؛ جیسا کہ امام خمینیؒ کا ارشاد ہے کہ اگر سارے انبیاء عظام ایک وقت میں ایک ہی مقام پر موجود ہوتے تب بھی ان کے درمیان ذرہ برابر اختلاف نہ پایا جاتا۔ کیونکہ اگر کہیں بھی انسانوں کے درمیان کوئی اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کے چند عوامل ضرور ہوتے ہیں مثلاً:

الف۔ ان افراد کا ہدف اور نصب العین ایک نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک کا مقصد اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ ہوتا ہے؛ لہٰذا ان کے درمیان اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک مسافر مشرق جانے والا ہو اور دوسرا مغرب جانے والا ہو تو یہ دونوں ہمسفر نہیں ہو سکتے اور ایک گاڑی میں دونوں ایک ساتھ سوار نہیں ہو سکتے۔

ب۔ اختلاف کا دوسرا عامل، افراد کے طریقۂ کار کا اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً دین کی خدمت کرنا سب کا ہدف ہوتا ہے لیکن اس ہدف کے حصول کیلئے ایک شخص سیاست یا جہاد کا راستہ اپناتا ہے اور دوسرا شخص علمی اور فلاحی خدمات کی فراہمی کے ذریعے اس ہدف تک پہنچنا چاہتا ہے۔ البتہ اس طرح کے اختلاف کی بھی دو وجوہات ہوتی ہیں:

۱) بعض اوقات متعدد راستے اپنانے کا سبب تقسیم کار ہوتا ہے؛ مثال کے طور پر ایک شخص تعلیم وتربیّت کا شعبہ سنبھال لیتا ہے تو دوسرا عسکری شعبہ اپنا لیتا ہے۔ لیکن دونوں کا ہدف ایک ہی ہوتا ہے اور دونوں

ایک ہی نظام کے اجزاء کی حیثیّت رکھتے ہیں۔لہٰذا ایسے افراد کے درمیان تعاون کی فضا پائی جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے کام کی تکمیل کرتے ہیں۔

۲) بعض اوقات ان افراد میں اختلاف کا سبب تقسیم کار نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے ہر ایک، اپنی روش کو برحق اور دوسرے کی روش کو باطل تصور کرتا ہے۔مثال کے طور پر کلمۂ حق کے اِعلاء کیلئے ایک فرد تبلیغ کو صحیح روش اور جہاد و سیاست کو غلط روش خیال کرتا ہے جبکہ دوسرا فرد برعکس نقطۂ نظر کا مالک ہوتا ہے۔ ایسے افراد کی مثال ان تاجروں کی سی ہوتی ہے کہ جو ایک دوسرے کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب اگر افراد کے درمیان اختلاف کی نوعیّت پہلی قسم کی ہو تو معاشرے کا ڈاکٹر، استاد، وکیل، تاجر وغیرہ وغیرہ، سیاستدانوں کی مدد کریں گے اور سیاستدان ان کی۔لیکن اگر اختلاف کی نوعیّت دوسری قسم کی ہو تو اس صورت میں ہر فرد دوسرے کو غلط قرار دے کر اسے کمزور کرنے کی کوشش کرے گا۔اور یوں پہلی قسم کا اختلاف اتحاد اور ہمکاری کا سبب بنتا ہے اور دوسری قسم کا اختلاف افتراق اور اختلاف ونزاع کا عامل بنتا ہے۔

ج۔ اختلاف کا تیسرا سبب، وسائل اور ذرائع کا فرق ہوتا ہے۔مثلاً دوستوں اور حامیوں کی وفاداری، تعداد، صلاحیت، مالی ذرائع، اسلحہ و بارود اور دشمنوں کی کمیت و کیفیت وحکمت عملی، حالات اور اوضاع زمانہ، معاشرہ کا باشعور ہونا یا نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔مثال کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو بہتر ایسے ساتھی ملے جنہوں نے کربلا کی اس قربانی کو اتنی عظمت بخشی۔لیکن امام حسن- کے ساتھی ایسے تھے کہ آپ کو دست بستہ دشمن کے حوالے کرنے کا سوچ رہے تھے۔حضرت امام حسینؑ کا دشمن ایک ناپختہ اور خودخواہ حکمران تھا لیکن حضرت امام حسنؑ کے مدمقابل ایک انتہائی مکار سیاستدان تھا۔

اختلاف کے ان تین عوامل میں سے حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے درمیان یقیناً پہلے دو عامل، باعث اختلاف نہیں ہوسکتے تھے۔کیونکہ حضرت امام حسینؑ کا مقصد اور نصب العین رضای الٰہی اور بس ''رضیٰ اللہ رضانا اھل البیت'' تھا اور حضرت امام حسنؑ کا مقصد اور نصب

العین بھی یہی تھا۔اب حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے درمیاں اختلاف، منزل تک پہنچنے کیلئے طریقۂ کار کا باہمی اختلاف بھی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آپ دونوں امام ہیں اور اپنی مسئولیت امامت کو معصومانہ صلاحیتوں کے ساتھ سرانجام دیا کرتے ہیں؛ چنانچہ ارشاد نبوی ہے'' **الحسن و الحسین امامان قاما او قعدا**''.

بنابرایں، حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے درمیاں اختلاف کا واحد سبب، وسائل، حالات، مدمقابل کی حیثیّت اور دوست و دشمن کا اختلاف ہی ہوسکتا ہے۔ حالات اور وسائل کے اسی اختلاف ہی کی وجہ سے نہ فقط حضرت امام حسن وامام حسین علیہما السلام کے درمیان صلح و جنگ کی صورت میں اختلاف نظر آتا ہے کہ حضرت امام حسنؑ حکومت دے دیتے ہیں اور حضرت امام حسینؑ جنگ کا راستہ اختیار کرتے ہیں بلکہ حضرت امام رضا علیہ السلام بھی ولایت عہدی قبول فرماتے ہیں۔

بلکہ کردار اور انتخاب کا یہ اختلاف تو خود ایک ہی معصوم کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر حضور اکرم ﷺ نے ۱۵ سال تک صبر وتحمل سے کام لیا اور آٹھ سالوں میں اسی کے قریب جنگیں لڑیں۔حضرت علی علیہ السلام نے ۲۵ رسال تک سکوت اختیار کیا اور پانچ سال میں تین عظیم جنگیں لڑین۔حضرت امام حسنؑ نے ابتداء میں جنگ کا راستہ اختیار کیا لیکن آخر میں صلح کر لی۔اور حضرت امام حسینؑ نے ابتداء میں صلح کا راستہ اختیار کیا لیکن آخر میں جنگ لڑنا پسند فرمایا۔

پس اسی لیے تو راہبر انقلاب اسلامی ایران، فرماتے ہیں کہ یہ معصومین چودہ کے بجائے اگر صرف ایک شخص ہوتا جس کی اتنی عمر لمبی ہوتی جتنی چودہ معصومین علیہم السلام کی ہے تو جو اقدامات وقت کے تقاضوں کے مطابق ان ہستیوں نے انجام دیے وہی ایک ہستی بھی یہ سب اقدامات ہو بہو انجام دیتی۔ بنابرایں، ان دو اماموں کی سیاست اور حکمت عملی میں فرق اور اختلاف کے اسباب اور عوامل کو جاننے کیلئے ہمیں معاویہ اور یزید کے درمیان کا فرق، آپ کے دوستوں اور دشمنوں اور عام مسلمانوں کے حالات کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا۔جیسا کہ خود نبی اکرم ﷺ اور حضرت علیؑ کے درمیان اسی وجہ سے حکمت عملی میں فرق نظر آتا ہے۔ اب ہم ذیل میں معصومین علیہم السلام کے درمیان

اختلاف کے حوالے سے ایسے ہی عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

نفاق اور کفر کا فرق

اگر چہ حدیث نبوی کے مطابق منافق کافر سے بھی زیادہ امت مسلمہ کیلئے خطرناک ہے لیکن زمانے اور معاشرے کے حوالے سے نفاق کا خطرہ کفر کی نسبت کمتر ہوتا ہے، کیونکہ منافقت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا بول بالا ہے اور منافق اپنے کفر کا اعلان بھی نہیں کرسکتا ہے۔ جبکہ اظہار کفر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اتنے بے ضمیر اور بے حس ہو چکے ہیں کہ کفر و اسلام کے درمیان ان کے لئے کوئی فرق نہیں رہا۔

بنی امیہ نے جو کہ دشمن اسلام اور دشمن پیغمبر تھے، اسلام کو نابود کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ہمیشہ ناکام رہے۔ مشرکین مکہ اور حضور کے درمیان ہونے والی تمام جنگوں میں قیادت کرنے والے یا بنیادی کردار ادا کرنے والے اسی قبیلہ کے بزرگان تھے۔ لیکن جب فتح مکہ کا موقعہ آیا تو لشکر اسلام کی طاقت اور عظمت کو جب اس خاندان نے دیکھا تو انہیں پتہ چل گیا کہ کفر کا علمبردار بن کر کامیابی کا حصول ممکن نہیں ہے۔ تو انہوں نے اندرونی کفر اور بیرونی اسلام (جس کو قرآن نفاق سے تعبیر کرتا ہے) کی روش کو اپنایا۔ چنانچہ حضرت علی -فرماتے ہیں کہ اس خاندان کے سردار نے دین کو ترک کیا ہے اور یہ اسلام کی بساط کو ایسا الٹا کریں گے جس طرح پوستین کو الٹا کیا جاتا ہے۔
(نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۸)۔

حضرت عمار یاسرؓ فرماتے ہیں: "**استسلمو ولم یسلموا**". (حماسہ حسینی) کہ انہوں نے ہتھیار ڈالا ہے مسلمان نہیں ہوئے ہیں۔ پھر ابوسفیان کا حضرت حمزہ کی قبر پر جا کر یہ کہنا کہ حمزہ! بادشاہت کے جس درخت کی تم اپنے خون سے آبیاری کی تھی وہ اب ہمارے بچوں کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا ہے۔ پھر حضرت قیس بن سعد بن عبادہ اور معاویہ کے درمیان تبادلہ ہونے والے خطوط کے مضامین اور مغیرہ بن شعبہ کی معروف روایت (مسعودی) جس میں امیر شام نے کہا تھا کہ جب تک نام محمد کو دفن نہ کروں، سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔ تو اس قسم کے دسیوں واقعات، تاریخ اسلام کی کتابوں

میں مرقوم ہیں حالانکہ بنی امیہ کے زور شمشیر اور مذہبی تعصب کی وجہ سے اس قسم کی دسیوں تاریخی دستاویزات غائب بھی ہوچکی ہیں۔(جیسا کہ تاریخ میں کئی مثالیں موجود ہیں)

خلاصہ یہ ہے ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اسلام کو نابود کرنا چاہتے تھے؛ کیونکہ اسلامی اصول نہ فقط ان کے خاندانی اور حکومتی مفادات کے منافی تھے بلکہ یہ لوگ خاندانی طور پر بھی اسلام اور حضرت محمد وآل محمدؐ کے دشمن تھے۔لہٰذا وہ منتظر تھے کہ ایک ایسا دن آئے کہ مسلمان اعلان کفر کو بھی برداشت کرلیں اور ساتھ ان کی بادشاہت بھی باقی رہے۔لہٰذا تاریخ بتاتی ہے کہ معاویہ خلیفہ کہلانے کی بجائے بادشاہ کے لقب سے زیادہ خوش ہوتا تھا۔

لیکن معاویہ اپنے دور میں کسی ایسے اظہار کی جرأت نہیں رکھتا تھا لہٰذا جو بھی ناجائز اعمال اس نے انجام دیئے اس کے لئے دین کا سہارا لیا؛ یہاں تک کہ جب حضرت علیؑ کو وہ سب کرتا تھا تو پہلے کہتا تھا خدایا تو گواہ رہنا کہ علی نے تیرے دین کو ترک کیا ہے یا اس میں بدعت ایجاد کی ہے۔لیکن یزید نے کفر کے الفاظ کو علی الاعلان زبان پر جاری کیا (جیسا کہ اس حوالے سے یزید کے اشعار معروف ہیں۔(معالم المدرستین، علامہ عسکری) اور اسی لیے تو مدینہ میں جب مروان نے حضرت امام حسینؑ سے مطالبہ کیا کہ آپ یزید کی بیعت کریں تو امام نے فرمایا:''**علی الاسلام السلام اذ بلیت الامة براع مثل یزید**''. یعنی یزید کی حکومت، اسلام کی نابودی اور اعلان کفر کے مترادف ہے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ خدا نے خود اسلام کی حفاظت کی ضمانت دی ہے تو پھر حضرت امام حسینؑ نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟ تو جواب یہ ہے کہ خداوند تبارک وتعالی نے انہی اہل بیت اطہارؑ اور قرآن ہی کے ذریعے تو اسلام کی حفاظت کی ضمانت فراہم کی ہے۔جیسا کہ جناب پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:''**انی تارک فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی اهل بیتی ان تمسکتم بهما لن تظلو بعدی ابدا**''. یعنی (میں تمہارے درمیان دو گراں چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں؛ ایک اللہ تبارک وتعالی کی کتاب ہے اور دوسرے میری عترت، میرے اہلبیت ہیں؛ کہ جب تک میرے بعد ان دونوں کا دامن تھامے رہو گے، گمراہ نہ ہو گے۔)

اسی طرح حدیث سفینہ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کربلا جیسی قربانیوں ہی کے ذریعے (جن کا تفصیلی ذکر فی الحال ممکن نہیں) خدا دین کی حفاظت کرتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت امام حسینؑ کیلئے اعلانِ کفر کے بعد خاموشی اختیار کرنا، ناممکن تھا۔ کیونکہ اسلام کی حفاظت آپ کی اور ہر مسلمان کی ذمہ داری تھی۔ اسی لیے تو جناب زینبؑ نے دربار یزید میں اپنے خطاب میں فرمایا: "**فو اللّٰہ لاتمحو ذکرنا و لاتمیت وحینا**". یعنی اے یزید! تمہارا مقصد ہماری وحی (اسلام) کی نابودی اور محافظ اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانا ہے لیکن قسم بخدا یہ بات تمہارے بس میں نہیں ہے ۔

گناہوں میں فرق

یزید کی حکومت سے پہلے اگر کبھی حکمران گناہ کرتے تھے تو اسے یا تو دوسروں کی نگاہوں سے چھپ کر انجام دیتے تھے یا اس گناہ کے انجام دینے کے جواز کے طور پر بعض جعلی احادیث کا سہارا لے کر پہلے اس گناہ کو شرعی طور پر جائز قرار دیتے تھے اور بعد میں اس کا ارتکاب کرتے تھے اور ان میں گناہ کو کھلے عام گناہ کے عنوان سے انجام دینے کی جرأت نہ تھی۔ اسی لیے تو امیر شام، یزید سے کہتا تھا: ''بیٹا! شراب تو بہت سے لوگ پیتے ہیں لیکن وہ چھپ کر ایسا کرتے ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کیا کرو''؛ یعنی شراب چھپ کر پیا کرو۔ (معالم المدرستین) لیکن یزید علی الاعلان گناہ کا ارتکاب کرتا تھا۔ اور اس کی وجہ بھی ہ ہے کہ اس کی پرورش بھی ایک غیر اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ جیسا کہ دربارِ ولید میں حضرت امام حسینؑ نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''**یزید رجلٌ فاجرٌ مُعلن بالفسق و مثلی لایبایع مثلہ**". (یعنی یزید ایک فاجر انسان ہے جو کھلے بندوں گناہ کرتا ہے اور مجھ جیسا یزید جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا) اسی طرح جب معاویہ یزید کی خلافت کی راہ ہموار کرنے کیلئے اور اس کی بیعت لینے کیلئے مدینہ آیا تو امام عالی مقام اور عبدالرحمٰن ابن ابی بکر، دونوں کا جواب ایسا ہی تھا کہ یزید اعلانیہ طور پر گناہ کرتا ہے اور امیر شام نے بھی اس بات سے انکار نہیں کیا اور نہیں کہا کہ نہیں وہ نیک آدمی ہے اور ایسے گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ حقیقت سب پر عیاں تھی؛ لہٰذا زیاد ابن ابیہ جیسا شقی انسان بھی معاویہ سے کہتا ہے کہ یزید کیلئے لوگوں سے بیعت کا مطالبہ کرنے سے قبل، اسے کہہ

دیں کہ کم ازکم ایک دوسال تک تو مہذب طریقے سے زندگی گزار لے۔

بنابرایں، دین اسلام میں گناہ اعلانیہ اور مخفی گناہ میں فرق ہے۔ جہاں ایک انسان کے دسیوں مخفی گناہ معاف کر دیے جائیں گے وہاں شاید اس کا فقط ایک اعلانیہ گناہ بھی معاف نہ کیا جائے گا۔ کیونکہ مخفی گناہ کرتے وقت صرف انسان اپنے اوپر ظلم کرتا ہے، لیکن معاشرے کو اس کے گناہ سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچاتا اور نہ ہی وہ شخص اپنے عمل کے ذریعے معاشرہ کو گناہ کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن جب ایک انسان اعلانیہ طور پر گناہ انجام دیتا ہے تو دراصل وہ اپنے اس عمل کے ذریعے گناہ کی قباحت اور برائی کو ختم کر دیتا ہے اور شریعت کی توہین کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ پس ایک طرف تو اعلانیہ اور مخفی گناہ میں فرق ہے، اور دوسری بات یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کے گناہ اور معمولی افراد کے گناہ میں بھی کافی فرق ہے۔ جیسا کہ ایک عرب شاعر کہتا ہے: **اذا کان ربّ البیت بالدّف مولعا فشیمة اهل البیت الرقص**

یعنی. اگر کسی خاندان کا بزرگ ڈھول بجانے والا ہو تو اس گھر کے باقی افراد بھی رقص کرنے لگیں گے۔ جب مسلمانوں کا حاکم، اسلام کے احکام کا عملی مذاق اڑاتا ہو تو عوام کی کیا حالت ہوگی؟ جب ایک ایسا شخص کہ جس کی ذمہ داری الٰہی حدود کا اجراء ہے، خود شرابی ہو تو شراب کی حد کون جاری کرے گا؟

اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن عالم کے ایک گناہ معاف ہوجانے سے پہلے جاہل کے ستر گناہ معاف ہو چکے ہوں گے۔ اور برعکس اگر کوئی عالم نیک ہے تو اس کی نیند اور آرام بھی جاہل کی عبادت سے بہتر ہے۔ کیونکہ اہم شخصیات کے نیک یا برے اعمال کا معاشرے پر پڑنے والا اثر انتہائی زیادہ ہوتا ہے۔ اور اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''**الناس علی دین ملوکهم**''. (یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں)۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جہنمیوں کی زبانی یہ بات نقل کرتا ہے کہ وہ لوگ بروزِ قیامت کہیں گے ''خدایا! ان سرداروں اور بزرگوں نے ہمیں گناہ پر اکسایا پس ان کو دُگنے عذاب میں مبتلا کر دے''۔

اب ان حقائق کی روشنی میں غور فرمایئے کہ اگر یزید اقتدار پر قابض رہتا اور لوگ اسے خلیفۃ المسلمین اور جانشینِ رسول کے طور پر قبول کر لیتے تو کیا اسلام پر عمل کرنے والا کوئی باقی رہ جاتا؟ اور یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ وہ دین جس پر عمل نہ ہو پائے وہ زندہ دین نہیں کہلاتا۔ زندہ دین وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی عملی زندگی میں نظر آئے ورنہ ایسا دین جس پر عمل انجام نہ پائے، اور وہ دین فقط نبی اکرم ﷺ کے ذریعے لوگوں تک نہ پہنچ پائے یا صرف لوح محفوظ پر باقی رہے تو ان دونوں میں کیا فرق ہے۔ اسی لیے تو قرآن مجید ہر مقام پر ایمان اور عمل صالح باہم دونوں کو باعث نجات قرار دیتا ہے۔

سورۂ مبارکۂ ''العصر''، اس حقیقت پر گواہ ہے۔ لہٰذا اب تک کی بات کا خلاصہ یہ ہوا کہ یزید سے پہلے کے حکمران اگرچہ گناہ تو کرتے تھے لیکن مخفی طور پر یا گناہ کا شرعی جواز ڈھونڈ کر؛ لیکن یزید علی الاعلان گناہ کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے پہلے کے حکمرانوں کے خلاف اتنے شدید ردّعمل کی ضرورت نہ تھی جتنی اس کے خلاف ضرورت تھی۔ کیونکہ اس کے ان گناہوں پر خاموشی، اس کی تایید سمجھی جاتی۔ لہٰذا حضرت امام حسینؑ پر یزید کے خلاف قیام، ضروری ہو گیا تھا۔ البتہ ہمارے موجودہ زمانے میں بھی مسلمانوں کا یہی حال ہے اور اس دور کے مسلمانوں کو بھی کم از کم سوچنا چاہیے کہ کہیں وہ یزیدِ وقت کی بیعت میں تو نہیں ہیں؟

ایک طرف شک و شبہ، دوسری طرف مردہ ضمیری

تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی وفات سے لے کر حضرت علیؑ کو خلافت ملنے تک، کسی بھی حکمران نے نہ فقط آل محمد کو تنہا کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، بلکہ امیر شام کو بھی مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی سیاست پر عمل پیرا رہے۔ اسی لیے رسولخدا ﷺ کی امت، اہل بیت اطہار علیہم السلام کے مقام سے بے خبر رہی اور حضرت علیؑ اور معاویہ کی جنگ کو حق و باطل کی بجائے قبیلۂ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے درمیان چلی آنی والی دشمنی کی ایک کڑی تصور کرنے لگی۔ اور معاویہ کی سازشوں کے ذریعے حضرت علیؑ تو نعوذ باللہ، بے نمازی، لیکن امیر شام کاتبِ وحی بن

گئے! حضرت علیؑ قاتلِ عثمان اور ظالم ٹھہرے اور معاویہ خواہ مخواہ میں خونِ عثمان کا طلبکار اور حق بجانب قرار پایا۔

اب اُس دور میں جنگ، مشکل کا حل نہ تھا؛ کیونکہ جنگ میں زیادہ طاقت رکھنے والا غالب آتا ہے چاہے حق پر ہو یا باطل پر۔ لیکن حضرات آئمہ اطہار علیہم السلام تو محافظِ اسلام ہیں لہذا انہیں اگر حکومت کرنے میں اسلام و مسلمین کو خطرہ نظر آئے تو اسے چھوڑ دینے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ کیونکہ حکومت کرنا تو ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے اور دین و ایمان کا بچانا ہدف ہے۔ اب اگر ذریعہ اور وسیلہ ہدف کو نقصان پہنچائے تو پھر وہ وسیلہ نہیں بلکہ مانع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر حکومت مقصد میں مانع بن جائے تو حضرت امام علی ؑ کی نظر میں بھیڑ کی چھینک سے بھی بدتر ہے؛ لیکن اگر اس کے ذریعے عدل و انصاف کا قیام ممکن ہو تو یہ ایک بہترین چیز ہے۔ لہٰذا اس صورتحال میں ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ لوگ جو کہ حضرت امام علیؑ کو بے نمازی اور مستحق لعن وطعن مانتے تھے یا وہ لوگ جو شک وشبہ میں مبتلا تھے، خود انہیں موقعہ دیا جاتا کہ وہ اپنی نگاہوں سے بنی امیہ کی حقیقت اور ان کی حقیقی تصویر کو حکومت کے آئینہ میں وہ خود دیکھ لیں۔ اور وہ خود فیصلہ کریں کہ حق کہاں ہے اور باطل کہاں۔ یعنی اگر حکومت سے دستبردار ہونے سے اگرچہ حکومت چلی جاتی ہے لیکن لوگوں کا ایمان محفوظ رہ سکتا ہے اور اہل بیت کی معرفت بہتر ہو سکتی ہے اور لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت علی ؑ اور معاویہ کے درمیان جنگ، اقتدار کی جنگ نہیں بلکہ اسلام کی بقاء یا نابودی کی جنگ ہے تو اہل بیت یہ قربانی دینے کیلئے تیار ہیں۔

پس حضرت امام علیؑ اور حضرت امام حسنؑ کے زمانے کے مسلمان ایک شک وتردید میں مبتلا تھے۔ جس سے انہیں نکالنے کیلئے وقت ملنا چاہیے تھا کہ اگر معاویہ کے ساتھ جنگ میں امام جیت بھی جاتے تب بھی یہ شک وشبہ باقی رہ جاتا۔ لیکن جیسا کہ خود حضرت امام حسنؑ نے بھی بتایا اور تاریخی شواھد اور قرائن بھی بتا رہے تھے کہ جیت معاویہ کی ہوگی، بلکہ حضرت امام علیؑ نے اس اموی جیت کی خبر بھی دے دی تھی اور آپؑ نے فرمایا تھا: ''**انّی لاظن انّ ھولاء القوم سیدون علیکم**... کہ شام والے

جیت جائیں گے اوران کے غلبہ کی وجوہات بھی آپ نے بیان کی جو کہ نہج البلاغہ میں مذکور ہیں۔

اور جب صلح کے بعد امیر شام کوفہ پہنچا تو اس نے واشگاف لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ اس جنگ کا مقصد معاشرہ میں احیاء نماز، روزہ، زکات اور حج وغیرہ نہیں تھا بلکہ مقصد حکومت کا حصول تھا جو حاصل ہو گیا۔ یعنی اس نے خود لوگوں کے شکوک کو دور کر دیا اور اُس کے بعد کے اعمال نے مزید حقیقت کو آشکار کر دیا۔ اب اس صورت میں حضرت امام حسنؑ کا جنگ لڑنا اور صلح نہ کرنا کیا نتیجہ دے سکتا تھا؟ اگر جنگ ہوتی اور امام کو شکست ہوتی تو معاویہ یزید جیسا بے وقوف نہ تھا۔ جیسا کہ اس نے یزید کو اپنی وصیت میں لکھا ہے کہ اگر حسینؑ قیام کرے تو تم اسے قتل مت کرنا چونکہ وہ فرزند رسول خدا ﷺ ہیں۔ یہ ایک پختہ سیاستدان کی بات ہے تا کہ کوئی اس پر اعتراض بھی نہ کر سکے ورنہ امام حسن مجتبیٰؑ کو زہر دلوانے والا کون تھا؟

یہی معاویہ ہی تو تھا۔ لہٰذا اگر جنگ ہوتی تو وہ امام حسنؑ کو اسیر کرتا اور پھر انہیں عزت واحترام کے ساتھ آزاد کر دیتا اور پھر بعد میں امام کے خاص ساتھیوں کو شہید کر دینے کے بعد خود امام کو بھی چپکے سے شہید کر دیتا اور ان پر احسان بھی جتاتا اور خود امت کے درمیان نیک نام بھی ہو جاتا۔ اسے فتح مکہ کے وقت جناب حسنین علیہما السلام کے نانا نے ان کو جو آزاد کیا تھا اور وہ اس شرمندگی میں مبتلا تھا، اس شرمندگی سے بھی نجات مل جاتی اور امام کے ساتھ اس کا کوئی معاہدہ بھی نہ ہوتا جس کا خوف ہر وقت اس کے دل پر چھایا رہتا۔ کیونکہ معاہدہ کی خلاف ورزی کو عرب کے مشرکین بھی برا مانتے تھے۔ اور یہی معاہدہ ہی تو تھا کہ معاویہ نے حضرت امام حسنؑ کو شہید کرانے کے بعد ہی یزید کیلئے بیعت کے مطالبے کی جرأت کی۔

پس یہاں پر جنگ جاری رکھنا اور شکست کھانا، امام کی جیت نہ تھا بلکہ یہاں پر صلح کرنا اور وہ بھی مشروط صلح، یہی حضرت امام حسنؑ کی جیت تھا اور مقصد کی جیت، اسلام کی جیت اور اہل اسلام کی جیت، امام حسنؑ کی صلح میں مضمر ہو گئی۔ کیونکہ صلح کا سب سے پہلا بند یہ تھا کہ معاویہ کتاب خدا اور سنت رسول پر عمل کرے گا۔ یہاں حضرت امام حسنؑ کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور اب اگر معاویہ کتابِ

خدا اور سنتِ رسولخدا ﷺ پر عمل نہ کرتا تو معاویہ کی باطنی حقیقت اور عہد شکنی اور قرآن وسنت سے انحراف سب لوگوں کے سامنے آجاتا۔ اسی طرح سے صلح کے معاہدے کے بقیہ بندوں نے بھی مسلمانوں کو ہر قسم کے شک وشبہ سے نکال دیا اور انہیں عملاً بتادیا کہ معاویہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ فقط اقتدار کے درپے ہے۔

لیکن امیر شام نے اپنے آپ کو بے نقاب ہوتے دیکھ کر ایک نیا منصوبہ تیار کیا اور وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو بے غیرت بنادیا جائے اور انہیں اجتماعی اور سیاسی احساس ذمہ داری سے محروم کر دیا جائے۔ انہیں حکومت اور سیاست کے مسائل سے لاتعلق کر دیا جائے۔ اور اس نے اس مقصد کے حصول کیلئے انتہائی ماکرانہ اور ماہرانہ نقشہ تیار کیا۔ اس نقشہ کے مطابق اس نے مخلص مؤمنین اور مسلمین کو قتل کروایا، جیلوں میں ڈالا یا پھر شہر بدر کر دیا۔ صغیف العقیدہ لوگوں کو مال ودولت یا حکومت عہدے دے کر خریدا۔ اور عام لوگوں کو جاہل رکھا گیا اور انہیں فقط یہی سمجھایا گیا کہ ان کی ذمہ داری حکومت وسیاست کے امور میں دلچسپی لینا نہیں ہے بلکہ انہیں اپنی روٹی اور کپڑے کی فکر کرنا چاہیے۔

معاویہ کے اسی کردار کی وجہ سے اہل کوفہ کی اکثریت، حق شناس اور حسینؑ شناس ضرور ہوگئی تھی، اور انہیں بہت سارے شکوک وشبہات سے نجات بھی ملی؛ لیکن یہ الگ بات کہ وہ اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر کوئی قدم اٹھانے کیلئے تیار نہ تھے۔ اسی لئے فرزدق نے حضرت امام حسینؑ کے جواب میں عرض کیا: ''**قلوبهم معک، سیوفهم علیک**''. یعنی (انہیں آپ کی معرفت تو ہے، لیکن عمل میں وہ بنی امیہ کے ساتھ ہیں) اور یہی وجہ تھی کہ جناب حضرت مسلمؑ کا ساتھ دینے والے مجاہدوں کو پراگندہ کرنے کیلئے آنے والی ان کی ماؤں، بہنوں، اور بیویوں کی بات بھی یہی تھی کہ حکومتی مسائل سے ہمارا کیا واسطہ؟

حکمرانوں کی سیاست ہمیشہ یہی رہی ہے کہ عوام کو سیاست سے دور رکھا جائے۔ قرآن مجید میں فرعون کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ''**فاستخفّ قَومَهُ فَاطاعوه**''. یعنی (اس نے اپنی قوم کو ذلیل بنایا تب انہوں نے فرعون کی اطاعت کی)۔ اور کیا وجہ ہے کہ آج مسلمان ایسے حکمرانوں کے

خلاف بغاوت کر کے، غلامی کی زندگی سے نجات پا کر آزادی کے حصول کیلئے کوشاں نہیں ہیں؟ وجہ یہی ہے کہ حکمرانوں نے ان سے اعتماد بنفس چھین لیا ہے اور انہیں اپنا بندہ اور غلام بنا لیا ہے؛ جیسا کہ مولا علی علیہ السلام ایسے ہی حکمرانوں کے ان کرتوتوں کے بارے میں فرماتے ہیں: ''**فاتّخذوا عباد اللّٰہ خَوَلاً**''. یعنی (ان ظالم حکمرانوں نے خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیا ہے)۔

بنی امیہ اپنی اس منحوس سیاست میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے مخلصین کو قتل عام کر کے یا پابند سلاسل بنا کر یا شہر بدر کر کے، دنیا پرستوں کو مال و دولت و حکومت دیے کر، عوام الناس کو بے وقوف بنا کر یا ذلیل، بے ضمیر اور مردہ ضمیر بنا کر، اسلامی مملکت کے سیاہ و سفید پر قبضہ کر لیا تھا۔

اب ان حالات میں عالم اسلام کی اس مشکل صورتحال کے حل کیلئے حضرت امام حسین- کے پاس فقط دو ہی راستے تھے:

۱)۔ تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کو بنی امیہ اور حاکموں کے ناپاک عزائم سے باخبر کرتے؛ تا کہ پوری امت اٹھے اور امام حسینؑ نے بھی یہی قدم اٹھایا۔ بلکہ امام حسینؑ سے قبل خود حضرت علیؑ نے اپنے خطبوں میں بنی امیہ کے خطرات سے مسلمانوں کو آگاہ کیا تھا۔ بلکہ حضور ﷺ کی متعدد احادیث میں اس خاندان کے خطرات سے مسلمانوں کو خبردار کر دیا گیا تھا۔ لیکن اموی لابی کی مشینری نے صدرِ اسلام ہی سے پیغام رسالت اور ولایت سے مسلمانوں کو باخبر ہونے نہیں دیا۔ بلکہ جعلی احادیث کے ذریعہ اور سنت پیامبر کے نقل و انتقال پر پابندی لگا کر حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر پیش کیا۔ اب بدقسمتی سے خود مولا امام حسین- کے زمانے میں معمولی تبلیغ کے ذریعے پیغام حق کو تمام مسلمانوں تک پہنچانا ناممکن ہو چکا تھا۔

اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ مولا امام حسینؑ نے دو مرتبہ اپنے خواص کو اپنا پیغام سنایا۔ ایک تو صحرای منیٰ میں حج کے دوران جہاں حاجیوں کی کثرت کی وجہ سے حکومت کے کارندے ناکار ہو جاتے ہیں۔ اس موقعہ پر آپ نے ایک خطبہ کے ذریعے حضرت علیؑ کی شان میں حضور ﷺ کی احادیث سنائیں اور سامعین سے درخواست کی کہ وہ ان فضائل کو دوسروں تک پہنچا دیں۔ اور

دوسرے خطبہ میں خواص کی آرام طلبی، مصلحت پسندی، سکوت اور بنی امیہ کے مظالم کو آپ نے بیان فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ کے ذریعے امت محمدی کی اصلاح کرنا ناممکن ہو چکا تھا۔ یعنی نہ پیغام پہنچانا ممکن رہا تھا اور جن تک پیغام پہنچ چکا تھا وہ بھی انتہائی مردہ ضمیر ہو چکے تھے۔ چنانچہ حضرت امام حسینؑ کے ایک سفیر نے پھانسی کے پھندے بھی لوگوں کو پیغام حسینی سنایا لیکن کوئی قابل ذکر اثر دیکھنے میں نہ آیا۔ اور امام حسینؑ نے جو قاصد بھیجے تھے انہیں یکے بعد دیگرے گرفتار کر کے شہید کر دیا گیا۔ کیونکہ اگرچہ امت کے اندر بالعموم جہالت تھی لیکن شیعیان علی تو حقیقت سے واقف تھے یا عام مسلمان جو کہ محبّ اہل بیتؑ اور دشمن بنی امیہ تھے وہ بھی حالات سے باخبر تھے۔ لیکن احساس ذمہ داری کا نہ ہونا، حب دنیا اور مردہ ضمیری نے انہیں چلتی پھرتی لاشیں بنا دیا تھا۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کی رگوں میں خون ڈال دیا جائے اور مردہ ضمیروں کو زندہ و بیدار کر دیا جائے۔ اس کام کیلئے تبلیغ کافی نہ تھی بلکہ کسی زندہ اور بیدار کر دینے والے اقدام کی ضرورت تھی۔ اور وہ اقدام خون کی ہولی ہی ہوسکتا تھا۔ اور فرزند رسول ﷺ نے عزت و احترام کی زندگی کو خیر باد کہا اور نانا کے دیار کو چھوڑ کر، کربلا کے چٹیل میدان میں قدم رکھا اور پیاس کے ذریعے، خون دے کر اور جگر گوشوں کے ٹکڑے اٹھا کر اور بہنوں کی چادریں لٹا کر آپ نے اُن مردوں ضمیر مسلمانوں کو زندہ کر دیا۔ کچھ اس طرح کہ وہ لوگ جو زندہ امامؑ کی فیوضات سے استفادہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے، وہ امام کے مقدس خون کی اس قربانی سے بیدار ہو کر وارث حسین کی اطاعت کریں اور اسلام کو بنی امیہ جیسے دشمنان اسلام سے بچائیں۔ خون دینا اور مظلومیت اگر صدائے حق کے ساتھ ہو تو ایسا اثر دکھا سکتا ہے اور اس نے ایسا اثر دکھایا بھی۔ لہٰذا انقلاب کربلا خون کا محتاج تھا نہ صلح یا سکوت کا؛ کیونکہ حضرت امام حسینؑ کے پاس صرف اپنی قیمتی جان تھی، سیدانیوں کی چادریں تھیں، اور جوانوں اور جانثاروں کی جوانیاں تھیں جنہیں آپ نے راہ دین پر قربان کر دیا۔

لہٰذا امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں امت کی ایک اہم مشکل شک و شبہ تھا جیسا کہ خوارج اسی شک و شبہ کی پیداوار تھے؛ جبکہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے زمانہ کی ایک اہم یا سب سے زیادہ اہم بیماری،

امت کی مردہ ضمیری تھی۔اُس مشکل کا حل صلح میں نہیں تھا بلکہ اس مشکل کا حل فقط خون دینے میں تھا۔ چنانچہ صلح ایک طرف امام حسنؑ نے خون حسین ابن علی علیہما السلام کو ضائع نہیں ہونے دیا کیونکہ آپؑ کی صلح نے بنی امیہ کے کریہہ چہرہ سے نقاب اٹھالیا تھا، اور دوسری طرف خون حسینی نے صلح امام حسنؑ کا مقصد پورا کر دیا اور سن ۶۱ ہجری میں نہ فقط امت کو بیدار کر دیا بیداری امت کا ایک دائمی سامان فراہم کر دیا۔

اگر چہ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام کے صلح اور جنگ کے امتیاز کی وجہ کے طور پر مذکورہ تین قسم فرق کے علاوہ اور بھی متعدد فرق بیان کئے جاسکتے ہیں لیکن مقالہ میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے یہاں عناوین کے ذکر پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

۱۔ چونکہ امام حسنؑ کا معاویہ کے ساتھ صلح نامہ کے ذریعے معاہدہ ہو چکا تھا، لہٰذا امام حسینؑ نے اس معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے معاویہ سے تو جنگ نہ کی لیکن یزید کے ساتھ نہ صرف ایسا کوئی معاہدہ نہ تھا بلکہ اس کا اقتدار پر آنا خود معاہدہ کی ایک آشکار خلاف ورزی تھا، لہٰذا اس کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے آپ میدان میں نکلے۔

۲۔ سقیفہ سے لے کر حضرت امام علیؑ کو ظاہری خلافت ملنے تک اقتدار پر آنے والے حکمرانوں نے ہر ممکن طریقے سے معاویہ کو مضبوط بنایا تھا اور خود معاویہ کی سیاست اور مکاری بھی نمایاں تھی اور اسے دین کو دین اور قرآن کو قرآن کے خلاف استعمال کرنے کا گُر خوب سمجھ آتا تھا لیکن یزید کے پاس ایسی ذہانت نہ تھی۔

۳۔ جس طرح کہ راہبر انقلاب اسلامی ایران بیان فرماتے ہیں امام حسینؑ کے عصر میں، کربلا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی تاریخ اسلام میں اس وقت تک کوئی مثال نہ تھی لیکن آئندہ کبھی بھی ایسا کوئی واقعہ پیش آسکتا تھا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ سے لے کر حضرت امام حسنؑ تک ہر معصوم نے اپنے انداز میں ایک خاص اسوہ پیش کیا۔ لیکن حضرت امام حسینؑ پر لازم تھا کہ ابد تک کیلئے ایسا اسوہ پیش کریں کہ اگر کبھی دین خطرے میں پڑ جائے اور ایک سچے مسلمان کے پاس دنیا کی سب سے بڑی

طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنے کیلئے خون ومظلومیت کے علاوہ اور کوئی اسلحہ نہ ہوتو پھر بھی وہ طاغوت سے ٹکرا جائے لیکن دین کی حفاظت سے دستبردار نہ ہو۔

۴۔ یزید نے تو حضرت امام حسینؑ سے بیعت مانگی تھی اور اس بیعت کے اسلام کی بقاٗ اور دین کی سلامتی کیلئے منفی نتائج برآمد ہوتا تھے۔لہٰذا حضرت امام حسینؑ بیعت نہ کرسکتے تھے۔اس کے برعکس،،جب معاویہ نے حضرت امام حسنؑ کو صلح کی کوشرائط پیش کیں تو صلح کا یہ مطالبہ اور یہ جنگ بندی مشروط تھی۔ اور حضرت امام حسنؑ نے تو صلح اور جنگ بندی کی یہ شرط رکھی کہ معاویہ کا لقب امیر المومنین نہیں ہوگا حالانکہ لقب اسلامی حکومت کے سربراہ کیلئے ایک خاص لقب اور عنوان کی حیثیت رکھتا تھا۔پس معاویہ کا مطالبہ جنگ بندی تھا جبکہ یزید کا مطالبہ بیعت۔لہذا جنگ بندی تو اسلام اور مسلمین کے حق میں کی جاسکتی ہے لیکن بیعت نہیں کی جاسکتی۔کیونکہ جنگ بندی میں حاکم کے اعمال اور کردار کی تائید نہیں ہوتی جبکہ بیعت میں حاکم کے تمام ناجائز اعمال کی بھی تصدیق وتائید ہوتی ہے۔

۵۔صلح امام حسنؑ کے وقت جو مسئلہ درپیش تھا وہ مسئلۂ خلافت تھا۔خلافت کی وہ شکل جو اس وقت موجود تھی اگرچہ ہمارے لیے اور ہمارے پیشواؤں کی نظر میں اشکال واعتراض سے خالی نہ تھی لیکن پھر بھی یہ سلسلہ بعض اصلاحات کے ہمراہ قابل قبول ہوسکتا ہے؛لیکن یزید کی حکومت تو ملوکیت تھی جو کسی بھی شکل میں قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

۶۔امام حسنؑ کے زمانے میں عالمِ اسلام پر روم کے حملہ کا خطرہ موجود تھا۔یہی وجہ ہے کہ آپ-اور معاویہ کے درمیان صلح کا معاہدہ طے پانے کی خبر سن کر روم کا لشکر واپس چلا گیا؛لیکن حضرت امام حسین ؑ کے قیام کے وقت عالمِ اسلام کو ایسا کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔

۷۔جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے،حضرت امام حسین اور حضرت امام حسن علیہما السلام کے ساتھیوں اور اصحاب میں بھی بڑا فرق تھا۔حضرت امام حسینؑ کے ساتھی ایسے باوفا تھے کہ ان کی وفاشعاری نے قیامِ عاشور کی عظمت کو دوبالا کردیا اور یہی وجہ ہے کہ واقعہ کربلا ابد تک زندہ رہے گا۔اس کے برعکس،حضرت امام حسن مجتبیٰؑ کے اصحاب کی حالت سب کو معلوم ہے۔آپ کے اصحاب

میں اکثریّت بک جانے والوں کی تھی اور وہ کسی طور بھی جنگ جاری رکھنے کیلئے آمادہ نہ تھے۔اور اگر آپ-شہید ہو جاتے شاید مظلومیتِ امام حسن مجتبیٰؑ کا ذکر کرنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔اور یوں آپ کا ہدفِ شہادت ناکام ہو جاتا کیونکہ شہادت کا مقصد تو ابد تک آنی والی نسلوں کا حق اور حقیقت کا پیغام پہنچانا ہوتا ہے اور یہ پیغام رسانی اسی صورت میں ممکن ہے جب شہید کو زندہ رکھنے والا کوئی موجود ہو۔

۸۔حضرت امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں معاویہ نے جناب عثمان کے خون کے مطالبے کا بہانے بنا کر لوگوں کے جذبات اپنے حق میں موڑ لیے تھے اور اُس نے آیۂ قصاص نعرہ بنا کر بغاوت کی تھی۔ لیکن قیام کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے قرآن وسنت کی آیات کے کی روشنی میں قیام کیا تھا اور یہاں یزید کے پاس بھی لوگوں کو بہکانے کا کوئی ہر بہ نہ تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہے کہ باطل حاکم کے خلاف قیام کرنا اور اسلامی حکومت وجود میں لانا ہر مسلمان پر واجب ہے، خصوصاً معصوم امام پر؛ خواہ یزید کے زمانے کی طرح کے انتہائی خطرناک حالات رونما نہ بھی ہوئے ہوں۔یہ بات خود حضرت امام حسین اور حضرت امام حسن علیہما السلام کے فرمودات سے صاف ظاہر ہے۔اور اسی طرح قرآن وسنت وسیرت معصومینؑ سے بھی یہ بات واضح ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت امام حسن مجتبیٰؑ نے صلح کیوں کی آپ نے قیام کیوں نہیں کیا؟ تو آپ کے قیام نہ کرنے کی وجہ کچھ ایسی رکاوٹیں اور موانع تھے جن کی وجہ سے قیام کرنا اہل حق کے حق میں نہ تھا۔

چنانچہ نماز پڑھنا، حج پر جانا، روزہ رکھنا، واجب ہے لیکن کچھ مشکلات اور موانع کی وجہ سے یہ وجوب ساقط بھی ہو جاتا ہے۔تو پھر ان اعمال کے سرانجام دینے والے سے نہیں پوچھا جاتا ہے کہ کیوں تم نے نماز پڑھی بلکہ نہ پڑھنے والے سے پوچھا جاتا ہے کہ کیوں تم نے ترک کیا۔یعنی اسلام کا حکم تو باطل اور ظالم کے خلاف قیام کرنا ہے، نہ کہ سکوت۔ بنابرایں، امام حسنؑ کے جنگ نہ کرنے اور صلح کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے، نہ کہ قیام عاشورا کیلئے۔لہٰذا صلح امام حسن مجتبیٰؑ کو بہانا بنا کر ظالم حکمرانوں کے سامنے خاموش اور لب بستہ لوگوں کو دلیل کی ضرورت ہے نہ کہ حضرت امام

حسینؑ کی سیرت کو اپنا کر ایسے فاسق حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والے مجاہدین کو۔ یہی وجہ ہے کہ خود امام حسن مجتبیٰؑ واجب الاطاعت امام ہونے کے باوجود بھی صلح کی وجوہات اور دلائل بیان فرماتے تھے۔

اگر چہ ان دو ہستوں کی سیرت سے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام میں جنگ کے موقعہ پر جنگ ضروری ہے اور صلح کے موقعہ پر صلح لازم ہے؛ لیکن یہ سب کچھ وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے۔ یعنی اسلام شناسی اور زمان شناسی ہر قسم کی جنگ اور صلح کی بنیادی شرط ہے۔ بنابرایں، نہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے درمیان کوئی مزاجی کا فرق ہے کہ نعوذ باللہ کہا جائے کہ ایک امام سخت مزاج تھے اور دوسرے نرم مزاج یا بعض دشمنان اہل بیت کی طرح یہ کہا جائے کہ امام حسنؑ عثمانی تھے اور امام حسینؑ علوی عقیدہ رکھنے والے تھے۔ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ''**الحسن و الحسین امامان قاما او قعدا**''. لہٰذا نہ تو آپ دونوں کے نصب العین میں کوئی فرق تھا اور نہ ہی دونوں کے طریقہ کار میں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ بھی سن ۵۱ ہجری تک صلح کے حامی تھے جبکہ دوسری طرف قیام کربلا کیلئے خود حضرت امام حسن مجتبیٰؑ نے بھی اپنے بیٹوں کو قربانی دینے کی وصیت کی تھی۔ پس اگر ان دو معصوم اماموں میں کوئی فرق موجود تھا تو وہ فرق حالات کا اور دراصل، یزید اور معاویہ کا فرق تھا۔ اگر کوئی فرق پڑ گیا تھا تو امت میں فرق پڑ گیا تھا اور ان دو اماموں کے اصحاب کی وفا شعاری میں فرق پڑ گیا تھا۔

اب آیئے ہم آپ یہ عہد کریں کہ ہم حضرت امام حسینؑ کے اصحاب کی طرح وفا شعار بن جائیں کہ جن کے ساتھ شہادت پر حضرت امام حسینؑ بھی فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنے اصحاب کی وفا کی تائید و تصدیق کرتے ہیں۔ وہ اصحابِ باوفا کہ جن کی زیارت میں آئمہ معصومؑ نے بھی ''**یالیتنا کنا معکم**'' (ائے کاش! ہم بھی تمہارے ساتھ ہوتے) کے الفاظ بیان فرمائے۔ اور خدا نہ کرے ہماری مثال حضرت امام حسنؑ کے ان اصحاب کی سی ہو جو عہد شکن تھے اور امام کا ساتھ دینے کیلئے دل سے آمادہ نہ تھے۔

شہادت امام حسنؑ کے بعد امام حسینؑ کی حکمت عملی

حجت الاسلام سید حسنین عباس گردیزی

امام حسین علیہ السلام عالم انسانیت کی وہ عظیم شخصیت ہیں جس نے پورے عالم کے افکار کو متاثر کیا ہے بلاتفریق مذہب وملت، ہر قوم نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے شعراء نے اپنے کلام کے ذریعے اظہار عقیدت کیا ہے مفکرین نے اپنے افکار کو بیان کیا ہے مورخین نے اپنی کتب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

امام حسین علیہ السلام کے بارے میں بالخصوص ان کے قیام اور واقعہ کربلا کے متعلق مصنفین نے جتنی کتب لکھی ہیں یا شعراء نے جتنا کلام پیش کیا ہے دنیا میں شاید ہی کسی اور کے بارے میں ہو واقعہ کربلا کے بعد سے لے کر ہزاروں قلم فرساؤں نے تحریریں لکھی ہیں سینکڑوں کتب، ہزاروں مقالہ جات تحریر کئے گئے ہیں لیکن پھر بھی اس موضوع پر تشنگی باقی ہے۔ مفکرین جتنا اس پر سوچتے ہیں فکر کے نئے دریچے کھلتے جاتے ہیں گفتگو کے نئے رخ سامنے آتے ہیں موضوع ہر آن تازہ نظر آتا ہے۔ اور اس یہ سب کچھ کا زیادہ حصہ امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے اس پہلو پر مشتمل ہے جو کربلا سے متعلق ہے یعنی رجب ۶۰ھ سے لے کر ۱۰ محرم ۶۱ھ تک کے حالات وواقعات۔ جبکہ تاریخ انسانیت کی اس عظیم ہستی نے زندگی کے ۵۷ سال بسر کیے ہیں ظاہر ہے ان کی زندگی کا ہر لمحہ انسانوں کے لئے ہدایت کا سامان لئے ہوئے ہے ان کی حیات طیبہ کا ہر دور عظیم اور پر اثر ہے لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ واقعہ کربلا سے پہلے کی زندگی اور سیرت پر روشنی ڈالی جائے۔ امام حسین علیہ السلام کی حیات طیبہ کو چند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر سایہ زندگی

2- خلفاء ثلاثہ کا دور حکومت۔ (حضرت علیؑ کا گوشہ نشینی کا زمانہ)

3- حضرت علی علیہ السلام کا ظاہری دور خلافت۔

4- امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا دور خلافت وامامت

5-امام حسن علیہ السلام کی شہادت کے بعد معاویہ کی موت تک

6۔ یزید ملعون کا دور حکومت (۶۰۔۶۱ ہجری)

کتب تاریخ میں پہلے اور آخری دور کے متعلق کافی مواد موجود ہے لیکن درمیان والے چار ادوار کے بارے میں بہت کم معلومات پائی جاتی ہیں اگر چہ تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کرنے سے کچھ نہ کچھ مواد ضرور مل جاتا ہے جو امام علیہ السلام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتا ہے جن سے عام لوگ آگاہ نہیں ہیں اس مختصر مقالے میں ان تمام ادوار کے متعلق بیان نہیں کیا جا سکتا البتہ امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے پانچویں دور پر کچھ گفتگو کی جاتی ہے اس پر بحث کرنے سے جہاں امام علیہ السلام کی شخصیت سے روشنی ملے گی وہاں اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کے دور میں کیوں قیام نہیں فرمایا؟ ۶۱ھ جمادی الاولی کے وسط میں امام حسن علیہ السلام نے امیر شام سے متعدد شرائط پر صلح کر لی اور حکومت اس کے حوالے کر دی معاویہ نے ان شرائط پر حاضرین کو گواہ بنایا جن میں معروف صحابہ اور تابعین شامل تھے، شرائط میں سے کچھ یہ تھیں:

۱۔ حکومت معاویہ کے حوالے اس شرط پر کی جاتی ہے کہ وہ کتاب الٰہی اور سنت نبویؐ اور خلفائے راشدین کی سیرت پر عمل کرے گا۔

۲۔ معاویہ کے بعد حکومت امام حسن علیہ السلام کے پاس ہوگی اور ان کے لئے کوئی حادثہ پیش آجائے تو پھر امام حسین علیہ السلام کے لئے ہے اور معاویہ کسی کو بھی اپنا جانشین یا خلیفہ نہیں بنا سکتا۔

۳۔ معاویہ امیر المؤمنینؑ پر سب وشتم بند کرائے اور علی علیہ السلام کو نیکی کے علاوہ کچھ نہ کہے۔

۴۔ تمام شیعیان علی ابن ابی طالبؑ کو امان ملے گی اور حق کو اس کے صاحب تک پہنچایا جائے گا۔[۱]

۵۔ معاویہ اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہلانے کا حق نہیں رکھتا اور نہ ہی امام حسنؑ کے سامنے کوئی شہادت قائم کر سکتا ہے۔

اس شرط کے اضافہ کرنے سے امام حسن علیہ السلام نے واضح کر دیا کہ وہ معاویہ کو رسول اللہؐ کا خلیفہ اور جانشین نہیں مانتے اور نہ ہی اس کی حکومت کو قانونی سمجھتے ہیں جب ان شرائط پر صلح ہوگئی

تو اس کے بعد معاویہ نے ان میں سے کسی شرط پر بھی عمل نہین کیا بلکہ اس کا مقصد صرف اقتدار کو حاصل کرنا تھا اسکا اظہار اس نے ابتدا ہی میں کر دیا۔ امام حسن علیہ السلام سے صلح کرنے کے بعد معاویہ نے کوفہ کا رخ کیا ۔نخلیہ[۲] کے مقام پر یا بنابرقول دیگر کوفہ شہر[۳] میں اس نے لوگوں سے خطاب کیا اور کہا: ''**واللہ انی ماقاتلتکم لتصلّوا ولالتصوموا ولا لتحجّوا ولا لتزکّوا، انّکم لتفعلون ذلک، وانما قاتلتکم لأ تأمّر علیکم وقداعطانی اللہ ذلک وانتم لہ کارھون...**''

''اللہ کی قسم! میں نے تمہارے ساتھ جنگ اس لئے نہیں کی تھی کہ تم نمازیں پڑھو نہ ہی اس لئے کہ تم روزے رکھو اور حج انجام دو اور اس لئے بھی نہیں کہ تم زکوٰۃ ادا کرو تم یہ کام ضرور انجام دو گے میں نے اس لئے جنگ کی ہے کہ تم پر حکومت کروں اور اللہ نے یہ حکومت مجھے دی ہے اگر چہ تم اس سے خوش نہیں ہو۔''

اس کے بعد اس نے کہا: ''**الا وانَّ کُل شیٔ اعطیت الحسن بن علیؑ تحت قَدَمَّی ھاتین لا افی بہ لہ بشیئ منھا**''[۴]

''آگاہ رہو! میں نے حسن بن علیؑ سے جو معاہدہ کیا ہے وہ میرے پاؤں کے نیچے ہے اور میں ان شرائط میں سے کسی پر بھی عمل نہیں کروں گا۔''

معاویہ نے ان شرائط کے برعکس عمل کیا اور آخر کار سن ۵۰ ہجری میں[۵] ایک سازش کے تحت جعدہ بن اشعث کے ذریعے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوا کر آپ کی زندگی کا چراغ گل کر دیا[۶] صلح کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ معاویہ کے بعد حکومت امام حسن علیہ السلام کے سپرد ہوگی اور ان کی شہادت کی صورت میں امام حسین علیہ السلام کے حوالے ہوگی اور معاویہ کوئی حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی کو اپنا جانشین مقرر کرے۔[۷]

باقی شرائط کی طرح معاویہ نے اس شرط کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے امام حسین علیہ السلام کی موجودگی میں اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا اور اس کی ولیعہدی کے لئے تمام علاقوں میں خطوط

لکھے اورلوگوں سے بیعت لینا شروع کردی۔معاویہ کے دل میں یزید کی ولیعہدی کا خیال کیونکر آیا اور کیسے آیا یہ الگ بحث ہے جس کی اس مختصر مقالے میں گنجائش نہیں ہے۔

مؤرخین کا کہنا ہے کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد معاویہ نے مصمم ارادہ کرلیا کہ یزید کوولی عہد مقرر کیا جائے اوراس کے لئے لوگوں سے بیعت لی جائے چنانچہ تمام اسلامی قلمرو کے گورنروں کومکتوب بھیجے گئے تمام اسلامی مملکت میں مدینہ کی اہمیت سب سے زیادہ تھی اوروہاں امام حسینؑ جیسی شخصیت موجود تھی امیر شام نے مدینے کے والی مروان بن حکم کوخط لکھا کہ کہ وہ مدینے کے لوگوں سے یزید کے لئے بیعت لے مروان نے لوگوں کوجمع کیااورمعاویہ کاحکم سنایا،لوگوں نے بیعت کرنے سے انکار کردیاان انکار کرنے والوں میں امام حسین بن علیؑ ،عبدالرحمٰن بن ابی بکر،عبداللہ بن عمراورعبداللہ بن عباس سرفہرست تھے مروان نے صورتحال سے معاویہ کوآگاہ کیا۔

معاویہ نے مروان کا خط پڑھنے کے بعد سمجھا کہ یہ اس کی کوتاہی ہے لہذا اسے معزول کرکے سعید بن العاص کووالی مقرر کردیا اوراسے خط لکھا کہ تمام مہاجرین وانصاراوران کی اولادیں جومدینہ میں موجود ہیں ان سے سختی کے ساتھ بیعت لی جائے اورکوئی رورعایت نہ کی جائے البتہ ان چنداشخاص پردباؤضرورڈالا جائے مگرسختی نہ کی جائے۔۸یہ افراد حسین بن علیؑ ،عبداللہ بن عمر،عبدالرحمٰن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر تھے معاویہ کاحکمنامہ ملتے ہی سعید بن عاص نے اہل مدینہ کو بیعت کی دعوت دی مگرسب نے انکار کردیااورکہا کہ جب تک یہ چنداشخاص بیعت کے لئے آمادہ نہیں ہوں گے ہم بھی بیعت کے لئے تیارنہیں ہیں سعید نے معاویہ کولکھا کہ اہل مدینہ ان اشخاص کے زیراثر ہیں اور جب تک یہ بیعت نہیں کریں گے کتنی بھی کوشش کیوں نہ کی جائے اہل مدینہ سے بیعت لینا ممکن نہیں۔

اس صورتحال کے پیش نظر معاویہ نے خود مدینہ آنے کاارادہ کیااسی سال وہ حج بیت اللہ کے بہانے شامیوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ مدینے پہنچا ان حضرات سے ملاقات پراظہار ناخشنودی کیااورعتاب آمیز گفتگو کی انھوں نے جب یہ رویہ دیکھا تو الگ الگ عمرے کے لئے مکہ روانہ ہوگئے معاویہ نے موسم حج تک مدینہ میں قیام کیااوراہل مدینہ کونرم کرنے کے لئے ان پرانعام واکرام کی

بارش کردی۔

اس کے بعد جب امیر شام مکہ پہنچا تو ان حضرات سے بڑے پرتپاک اوراحترام سے ملاقات کی اور ہرایک کا نام اس کی شخصیت کے مناسب لقب کے ساتھ لیاامام حسین علیہ السلام کوسید شباب المسلمین کہا:

''مناسک حج کی بجا آوری کے بعد معاویہ نے ان سب کوایک جگہ طلب کیا جب یہ افراد معاویہ کے پاس پہنچے تو اس نے شایان شان احترام کیا اور کہا کہ تم نے دیکھا میں تم پر کس قدر مہربان ہوں تم میرے خون وجگر ہواس لئے تم سے لطف وعنایت کا برتاؤ کرتا ہوں اب یزید تمہارا بھائی اور ابن عم ہے میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ خلافت پہ اس کا نام ہوجائے باقی سب معاملات تمہارے ہاتھ میں رہیں تم جو چاہو گے وہی ہوگا امر ونہی کا سب اختیار تمہیں ہی رہے گا یہ سن کر سب خاموش ہوگئے دراصل سب نے انکار کردیا اگلے دن معاویہ نے جلسہ عام بلوایا جس میں سب لوگ شریک ہوئے جو اسلامی مملکت کے تمام علاقوں سے حج پر آئے ہوئے تھے مذکورہ افراد کو بھی بلایا ہرایک کے سر پر دو دو مسلح سپاہی تعینات کردیئے گئے معاویہ منبر پر گئے خطبہ دیا اور اس کے بعد لوگوں سے یزید کی بیعت کرنے کے لئے کہا اور کہا کہ ان افراد نے اس کی مخالفت نہیں کی اور سب نے یزید کی بیعت کرلی یہ کہہ کر معاویہ منبر سے نیچے اتر آیا اور عام لوگوں نے یزید کی بیعت کرنا شروع کردی۔[9]

اس طرح سے معاویہ نے زبردستی اور لوگوں کو دھوکہ دے کر یزید کے لئے بیعت لی ابن قتیبہ نے اس حوالے سے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے جب معاویہ مدینے آیا تو اس نے دوسرے دن ابن عباس اور امام حسین علیہ السلام کو بلوایا جب آپ آئے تو اس نے آپ کو اپنی داہنی جانب جگہ دی اور حال احوال پوچھا امام حسین علیہ السلام نے مناسب جواب دیا اور خاموش ہوگئے۔

معاویہ نے گفتگو کا آغاز کیا: ''اور رسول اللہؐ کی تعریف وتوصیف کرنے کے بعد یزید کی بیعت کا معاملہ پیش کیا اور یزید کو بڑے بڑے القاب سے یاد کیا اور اس کی اچھی اچھی صفات کو تذکرہ کرتے ہوئے اس کی بیعت کرنے کے لئے امام حسینؑ کو کہا امام علیہ السلام نے جواب میں

فرمایا: ''جو کچھ تو نے یزید کی لیاقت اور امت اسلامی کے امور چلانے کی اہلیت کے بارے میں کہا ہے وہ معلوم ہے۔

اے معاویہ! تو لوگوں کو یزید کے بارے میں دھوکہ دینا چاہتا ہے گویا کہ تو کسی ایسے شخص کا تعارف کرا رہا ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ یا غائب ہو جسے لوگوں نے دیکھا ہی نہ ہو یا اس کو صرف تو ہی جانتا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ یزید نے اپنی شناخت خود کرائی ہے اور اپنا ضمیر فاش کر دیا ہے یزید کا تعارف کرانا ہے تو یوں کراؤ کہ یزید کتوں اور کبوتروں سے کھیلنے میں مشغول رہنے والا ہے وہ ایک ابوالہوس آدمی ہے اور اپنا بیشتر وقت راگ رنگ اور رقص و سرور کی محفلوں میں گزارتا ہے یزید کا یہ تعارف کراؤ اور اس کے علاوہ سعی لا حاصل نہ کرو۔

اس امت پر تم نے جس قدر جرائم کیے ہیں کافی ہیں اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مذید بار گناہ اٹھا کر جانے کی کوشش نہ کرتم نے اس قدر ظلم وانحراف کیا ہے کہ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اب تیرے اور تیری موت کے درمیان چند لمحے باقی رہ گئے.....''[10]

اب ہم اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ آخر آپ نے معاویہ کی حکومت کے خلاف کیوں قیام نہیں کیا حالانکہ اس نے امام حسنؑ سے صلح کی کسی شرط پر بھی عمل نہیں کیا؟

اس مختصر مقالے میں شاید ہم ان تمام علل واسباب کا جائزہ نہ لے سکیں البتہ ایک دو باتوں کی طرف اشارہ ضرور کریں گے؛ جب ۴۱ھ میں امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کر لی اور اس کے بعد صلح کی شرائط پر عمل نہ کیا بلکہ شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عراق کے شیعوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ان میں سے بہت سے نامور اور صالح ترین افراد جیسے رشید ہجری، عمرو بن حمق خزاعی، جویرہ بن مسہر عبدی، عبداللہ بن یحیی حضرمی اور ان کے ساتھیوں اور اسی طرح حجر بن عدی کندی اور ان کے بھائیوں اور ساتھیوں کو قتل کرا دیا اور عراق میں ظلم وستم کا بازار گرم کر دیا تو کوفے کے معززین اور قبائل کے زعماء نے اجتماع کیا اور اموی حکومت کے مظالم اور انحرافات پر بحث وگفتگو کی اور صلح کی شرائط کی عدم پاسداری کو زیر بحث لائے نتیجے کے طور پر انہوں نے زعماء کوفہ پر مشتمل ایک وفد مدینہ میں امام حسنؑ کی خدمت میں

بھیجا تا کہ وہ ان مسائل پر آپؑ سے گفتگو کرے اور آپ کو معاویہ کے خلاف دوبارہ جنگ کرنے پر آمادہ کریں اور صلح کی شرائط کی مکمل خلاف ورزی پر اسے توڑنے پر قائل کریں اور اگر وہ انکار کریں تو پھر وہ یہی مطالبات لے کر امام حسینؑ کے پاس جائیں شاید وہ ان کے مطالبات مان لیں کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ امام حسینؑ معاویہ کے انحرافات اور ظلم وستم پر سخت ناراض اور غصہ میں ہیں۔

چنانچہ وفد کوفہ سے روانہ ہوا مدینہ پہنچا اور پروگرام کے مطابق امام حسنؑ کے پاس گیا جب انہوں نے اپنی چاہتوں کے مطابق جواب نہ پایا تو وہ امام حسنؑ کی خدمت میں آئے تا کہ ان کے ذریعے سے امام حسنؑ کو معاویہ سے صلح نامہ پر نظر ثانی کے لیے آمادہ کریں یا یہ کہ امام حسینؑ خود قیام کریں۔امام حسینؑ نے انہں جواب دیا؛

''قد کان صلح و کانت بیعة کنت لها کارها، فانتظر و امادام هذا الرجل (یعنی معاویه)حیاً، فان یهلک نظرنا و نظرتم ''

''صلح ہو چکی ہے اور مجبوراً بیعت ہے ہمارے لیے پس تم انتظار کرو جب تک یہ شخص (یعنی معاویہ) زندہ ہے جب یہ شخص مر جائے تو اس وقت ہم اور آپ دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے؟''[11]

اس جواب کے بعد وہ وفد واپس کوفہ چلا گیا۔اس کے بعد عراق کے شیعوں اور امام حسینؑ کے درمیان مسلسل رابطہ رہا اور خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا اس تمام عرصہ میں آپ انہیں صبر اور انتظار کرنے کی تلقین فرمائی۔جب ۵۰ھ میں امام حسنؑ کو زہر سے شہید کر دیا گیا تو عراق کے شیعہ دوبارہ متحرک ہو گئے اور انہوں نے امام حسینؑ کو خط لکھا جس میں انہوں نے بھائی امام حسنؑ کی وفات پر تعزیت کے ساتھ آپ کو صلح کا پیمان توڑنے اور معاویہ کے خلاف قیام کرنے کی دعوت دی۔انہوں نے لکھا:

ہم تک حسن بن علیؑ کی رحلت کی خبر پہنچی سلام ہو ان پر جس دن وہ پیدا ہوئے جن دن انہوں نے کوچ کیا اور جس دن وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور انہیں اپنے نبی محمدؐ سے ملحق فرمائے اور ان کے مصائب پر ان کے اجر میں اضافہ فرمائے اور ان کے بعد آپؑ کے لیے یہ مصیبت اچھائی میں بدل دے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حساب وکتاب ہے''**انا للہ**

وانا الیہ راجعون''

اس امت پر اس سے بڑھ کو اور کونسی مصیبت ہوسکتی ہے یہ آپ کے خاص شیعہ ہیں، آپ امیر المومنینؑ کے فرزند اور رسول خداؐ کی بیٹی کے بیٹے ہیں، ہدایت کا علم، شہروں کا نور ہیں اور دین کے قائم ہونے کی امید آپ سے ہے صالحین کی سیرت کا اعادہ آپ کے دم سے ہے آپ اس مصیبت پر صبر کریں (اللہ آپ پر رحم فرمائے) کیونکہ صبر کرنا ہی پختہ امور میں سے ہے آپ اپنے سے پہلے والوں کے جانشین ہیں اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے اسے جو آپ کی راہنمائی میں چلتا ہے۔

اور ہم آپ کے شیعہ ہیں جو آپ کی مصیبت پر حزن وملال رکھتے ہیں آپ کے غم سے غم واندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں آپ کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں آپ کی سیرت پر چلنے والے ہیں آپ کے حکم کے منتظر ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو شرح صدر دے آپ کے ذکر کو بلند کرے اور آپ کو اجر عظیم عنایت فرمائے آپ کی مغفرت کرے اور آپ کے حق کو آپ کی طرف پلٹا دے۔ والسلام[۱۲]

امام حسینؑ نے ان کا خط پڑھا اور انہیں جواب میں لکھا:

''مجھے پوری امید ہے کہ صلح کے بارے میں میرے بھائی کی رائے اور ظالموں سے جہاد کے بارے میں میری رائے صحیح اور پختہ اور شد و ہدایت پر مبنی ہے پس فی الحال اپنے آپ کو ظاہر نہ کرو اور زمین سے چمٹے رہو اور ہدایت کا دامن نہ چھوڑو جب تک یہ ھند کا بیٹا زندہ ہے اگر اسے کوئی حادثہ پیش آیا اور میں زندہ ہوا تو انشاء اللہ اپنی رائے اور موقف کا اظہار کروں گا''[۱۳]

لیکن عراق کے شیعوں خصوصاً اہل کوفہ نے خطوط اور وفود کا سلسلہ جاری رکھا اور آپؑ انہیں صبر وتحمل اور معاویہ کی موت کے انتظار کا کہتے رہے۔ آخری وفد مسیّب بن نخبہ کی سربراہی میں کوفہ سے مدینہ آیا جو معاویہ کے خلاف قیام کا مطالبہ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ''ہم آپؑ کی رائے جانتے ہیں اور آپؑ سے پہلے آپ کے بھائی کی رائے کو بھی۔'' امام حسینؑ نے انہیں جواب دیا: میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو اس کی نیت کی جزا دے گا اور مجھے ظالموں کے خلاف جہاد سے میری محبت کی نیت کی جزا دے گا۔''[۱۴]

امام حسینؑ کے پاس کوفہ کے وفود اور خطوط کا آنا حکمرانوں سے پوشیدہ نہیں تھا بلکہ حاکم مدینہ مروان بن الحکم نے اس پر معاویہ کو خط بھی لکھا اور اسی کے ردعمل کے طور پر معاویہ نے امام حسینؑ کو مکتوب لکھا اور اپنے عہد و پیمان اور صلح کی پابندی کی تاکید کی۔

معاویہ امامؑ کو لکھتا ہے: ''میرے پاس آپ کی سرگرمیوں کی خبریں پہنچی ہیں اگر یہ خبریں سچ ہیں تو مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں تھی اور اگر یہ خبریں غلط ہیں تو بجا ہے کیونکہ میں ایسی باتوں سے آپ کو بری سمجھتا ہوں جو عہد آپؑ نے خدا سے کیا ہے اسے پورا کریں اور مجھے بھی ایسا کرنے پر مجبور نہ کریں اگر آپ میری اور میری حکومت کی تائید نہیں کریں گے تو میں بھی آپ کو جھٹلانے کی کوشش کروں گا اور اگر مجھ سے چال بازی سے پیش آئیں گے تو میں بھی ایسا ہی کرونگا خدا سے ڈریں اور امت اسلامی کو اختلاف اور فتنہ سے بچائیں۔''[۱۵]

امام حسینؑ نے اس جواب میں تحریر فرمایا:

''امابعد تمہارا خط ملا تم نے لکھا تھا کہ میرے بارے میں تم تک ایسی خبریں پہنچی ہیں جو زعم خود میرے لیے زیب نہیں دیتیں اور تیرے نزدیک یہ باتیں میرے شایان شان نہیں ہیں یہ بات ذہن میں رہے کہ نیکی کی ہدایت صرف اللہ ہی دیتا ہے اور وہ باتیں جو میرے بارے میں تم تک پہنچی ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں جو سخن چینی کرنے والوں تفرقہ اندازوں اور اختراع پردازوں کی خود ساختہ ہیں نہ میں نے تمہارے خلاف جنگ کرنے کی تیاری کی ہے اور نہ تمہارے خلاف قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یہ باتیں تمہارے خوف اور تم سے عذر خواہی کے ڈر یا تمہارے ظالم، ملحدین اور بے دین ساتھیوں کے ڈر کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ خوف خدا کی وجہ سے کیا تم ''حجر بن عدی'' اور اس کے ساتھیوں جو نمازی اور عبادت گزار تھے کے قاتل نہیں ہو؟ جن کا گناہ صرف یہی تھا کہ انہوں نے ظلم و بدعت کا مقابلہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور راہ خدا میں کسی کی پرواہ نہ کی اور اس کے باوجود تم نے انہیں ظلم و ستم سے شہید کر دیا جبکہ ان کو امان دی جا چکی تھی اور گزشتہ واقعات کے تحت ان کو اذیت نہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود تم نے ان کے خون سے ہاتھ رنگے کیا تم رسولؐ کے صحابی ''عمرو ابن

حمق'' کے قاتل نہیں ہو؟ کیا اس بندہ صالح کو تم نے امان دینے کے بعد قتل نہیں کیا؟ کیا تم وہ شخص نہیں ہو جس نے زیادہ ابن سمیہ کو جو ثقیف کے چند کمینوں کے ہاں پیدا ہوا تھا اپنا بھائی بنا لیا جب کہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ بچہ اپنے باپ کا ہوگا اور زانی کو سنگسار کیا جائے تم سے سنت رسولؐ کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کی اور اللہ کی ہدایت سے انحراف کیا اور اس کے بعد تم نے اس ''زیاد'' کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا۔ کیا تم وہ نہیں ہو جس نے اہل ''حضر موت'' کو علیؑ کے ساتھ محبت کرنے کے جرم میں قتل کر دیا جب سمیہ کے بیٹے نے اطلاع دی کہ اہل حضر موت دین علیؑ کے پیروکار ہیں تم نے اسے نہیں لکھا کہ جو شخص علیؑ کے دین کا پیروکار ہو اسے قتل کر دو سمیر کے بیٹے نے تیرے حکم پر ان کو قتل کیا اور ان کو مثلہ کیا حالانکہ علیؑ کا دین رسول اکرمؐ کا دین ہے اور اسی دین کی خاطر علیؑ نے تمہارے بزرگوں کو تہہ تیغ کیا تھا اور اسی دین کے نام سے تو اب حکومت کر رہا ہے، معاویہ! تم نے لکھا تھا کہ میں اپنی جان، اپنے دین اور امت محمدؐ کا خیال رکھوں اور اس امت میں اختلاف اور فساد نہ کروں میرے نزدیک اس امت پر تیری حکمرانی سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں ہے جب میں اپنی ذمہ داری اپنے دین اور امت محمدؐ کی خاطر سوچتا ہوں تو تم سے لڑنا میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے معاویہ! تم نے لکھا تھا کہ اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی بدی کی تو تم بھی میرے ساتھ بدی کرو گئے اور اگر میں نے تم سے دشمنی کی تو تم بھی مجھ سے دشمنی کرو گے میں آج تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم سے جس قدر ممکن ہو سکے مجھ سے دشمنی کرو مجھے اطمینان ہے کہ تمہاری دشمنی میرے لیے نقصان دہ نہ ہوگی نقصان ہوگا تو تمہیں ہوگا کیونکہ تم جہالت کی سورای پر سوار ہوا اور عہد شکنی کے حریص مجھے اپنی جان کی قسم کہ تم نے اپنی کسی شرط پر عمل نہیں کیا صلح، صفائی عہد و میثاق اور امن کے معاہدے کے بعد تم نے کچھ لوگوں کو شہید کر دیا جن کا گناہ صرف یہی تھا کہ وہ ہمارے فضائل کے قائل تھے اور ہماری عظمت بیان کرتے تھے خدا تمہارے ان جرائم کو فراموش نہیں کرے گا اور بے بنیاد الزامات پر ان بندگان صالح کے قتل اور ان کو اپنے گھروں سے نکال کر شہر بدر کرنا ہرگز نہیں بخشے گا۔''

مذکورہ باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے اپنے بھائی حسن بن علی ÷ کے معاویہ

کے ساتھ صلح کے پیمان کی مکمل پاسداری کی ہے جب کہ اس کے برعکس معاویہ نے اس کی تمام شرائط کو پس پشت ڈال کر اپنے عزائم اور سازشوں کو جاری رکھا لیکن معاویہ کی خلاف ورزیوں کی نشاندہی کی اور ان پر اس کی خبر بھی لی اس کی بعض تمناؤں کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنے اور اپنے موقف کا برملا اظہار بھی کیا۔ جہاں تک معاویہ کے خلاف قیام کا تعلق ہے اس میں امامؑ مصلحت نہیں دیکھتے اور اس کے لیے مناسب وقت کے انتظار میں تھے البتہ اپنے قیام کے لیے مسلسل زمین ہموار کرتے رہے۔

اگر امام حسینؑ عہد معاویہ میں قیام فرماتے تو معاویہ امام حسنؑ کی تحریک اور قیام کو بدنام کرنے کے لیے صلح امام حسنؑ سے فائدہ اٹھاتا کیونکہ لوگوں کو پتہ تھا کہ امام حسنؑ نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ جب تک معاویہ زندہ ہے وہ سکوت اختیار کریں گے۔[16]

اگر امام حسینؑ عہد معاویہ میں قیام فرماتے تو معاویہ امام حسن علیہ السلام کی تحریک اور قیام کو بدنام کرنے کے لئے صلح امام حسنؑ سے فائدہ اٹھاتا کیونکہ لوگوں کو پتہ تھا کہ امام حسنؑ نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ جب تک معاویہ زندہ ہے وہ سکوت اختیار کریں گے۔[17]

البتہ یہ معلوم ہے کہ امام حسینؑ اس معاہدہ کو لازم یا واجب الوفاء نہیں جانتے تھے کیونکہ یہ معاہدہ اختیاری نہیں تھا بلکہ مجبوراً کیا گیا تھا خود معاویہ نے صلح کی تمام شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے معاہدہ توڑ دیا تھا اور وہ اس کی حرمت کا قائل نہیں تھا لہذا یہ معاہدہ صحیح بھی ہوتا تب بھی خود معاویہ کی جانب سے اس کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے امام حسین علیہ السلام اس کے پابند نہیں تھے۔

دوسری طرف جس معاشرے میں امام حسینؑ زندگی بسر کر رہے تھے وہ کسی انقلاب اور قیام کا اہل نہ تھا یہ معاشرہ آرام وسکون کو ترجیح دیتا تھا اور سوچتا تھا کہ چونکہ امام علیہ السلام نے یہ معاہدہ کیا ہے لہذا انھیں اسے پورا کرنا چاہئے اور گمان غالب یہ ہے کہ اگر یہ قیام اس دور میں ہوتا تو سیاسی اور اجتماعی دونوں میدانوں میں کامیاب نہ ہوتا کیونکہ اس وقت کے لوگ اسے اسی زاویہ سے دیکھتے جو معاویہ نے ان کے لئے مقرر کر رکھا تھا اور وہ یہی صلح کا معاہدہ تھا معاویہ رائے عامہ کے سامنے یہی کہتا کہ امام حسینؑ کا قیام غیر قانونی ہے اور معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔

سلیمان بن صرد خزاعی کو امامؑ نے جواب دیا تھا اس کا مطلب یہی ہے، آپؑ نے فرمایا:

''جب تک معاویہ زندہ ہے اس وقت تک ہمارے شیعیوں کو چاہیئے کہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں میں اس مصالحت کے لئے ہرگز راضی نہیں تھا اگر معاویہ مرجاتا ہے تو اس وقت ہم اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔[۱۸]

جن اسباب وعوامل کی بنا پر امام حسن علیہ السلام نے صلح کی تھی وہ اسباب اور عوامل اب بھی موجود تھے اگر معاویہ کے خلاف قیام کا کوئی راستہ ہوتا تو امام حسن علیہ السلام ضرور جنگ کرتے اور صلح نہ فرماتے امام حسین علیہ السلام کے سامنے بھی وہی مشکلات تھیں مذید یہ کہ صلح کے بعد معاویہ زیادہ طاقتور ہو چکا تھا اور ان حالات میں قیام اور تحریک کی کامیابی یقینی نہ تھی۔

ایسے حالات میں امام حسین علیہ السلام کے لئے اس امر کی ضرورت تھی کہ ہر چیز سے پہلے لوگوں کو قیام کے لئے تیار کریں لہذا امام حسینؑ نے اس دور میں اپنے قیام کے لئے افراد کو تیار کیا ہے اور لوگوں کو آگاہی دی ہے جس کا ثبوت منیٰ میں امت کے سرکردہ افراد سے آپ کا خطاب ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

سلیم بن قیس روایت کرتے ہیں کہ معاویہ کی موت سے دو سال قبل امام حسین علیہ السلام حج پر تشریف لے گئے ان کے ہمراہ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفر بھی تھے امام علیہ السلام نے بنی ہاشم کے مردوں اور عورتوں کو جمع کیا اور انصار میں اپنے دوستوں کو اکٹھا کیا جو امام حسین علیہ السلام اور ان کی اہل بیتؑ کو پہچانتے تھے اس سال حج پر آئے ہوئے رسول اللہؐ کے تمام اصحاب کو جو عبادت وتقویٰ میں مشہور تھے کو بلانے کا حکم دیا اس طرح سے منیٰ میں سات سو سرکردہ افراد جمع ہو گئے جن میں اصحاب نبیؐ کی تعداد دو سو کے قریب تھی زیادہ تر یہ افراد تابعین تھے جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنے کے بعد فرمایا:

''تم دیکھ رہے ہو کہ اس باغی وسرکش نے ہمارے اور ہمارے شیعوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اگر میں سچ کہوں تو میری تصدیق کرنا اور اگر غلط کہوں تو میری

تکذیب کرنا میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے حق کا واسطہ دیتا ہوں اور اپنی رسول اللہؐ سے قرابتداری کے واسطہ دیتا ہوں کہ جب تم یہاں سے واپس جانا تو تم پر لازم ہے کہ میری باتوں کو اپنے اپنے علاقوں میں مورد اعتماد افراد سے بیان کرنا اور انھیں ہمارے حق کے بارے میں جو تم جانتے ہو، دعوت دینا مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ مسئلہ غفلت کا شکار نہ ہو جائے اور حق بالکل غائب اور مغلوب ہو جائے:"**واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون**" ۱۹

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت اور ان کی تفسیر بیان فرمائی اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ آپ کے والد گرامی، والدہ گرامی اور بھائی ذی وقار اور خود آپ اور اہل بیت کے متعلق فرمایا تھا وہ سب فضائل ایک ایک کر کے بیان کیے جب آپ کوئی حدیث بیان فرماتے تو محفل میں موجود اصحاب تصدیق کرتے اور کہتے ہاں ہم نے سنا اور دیکھا۔اسی طرح موجود تابعین کہتے کہ ہم نے مورد اطمینان اور معتمد اصحاب سے یہ سنا ہے۔۲۰

اس کے بعد آپ نے انھیں لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کی۔اس روایت سے یہ امر واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اموی حکمرانوں کی طرف سے فضائل اہلبیتؑ پر مشتمل احادیث نبویؐ کو نقل اور بیان کرنے پر سخت پابندی اور قدغن تھی اسی بات نے امام حسین علیہ السلام کو مجبور کیا کہ وہ حج کے موقعہ پر منیٰ میں ایسا اجتماع منعقد کریں جس میں رسول اللہؐ کے بچ جانے والے اصحاب اور بڑے بڑے تابعین شریک ہوں اور آپ انھیں فضائل اہلبیتؑ یاد دلائیں یوں لگتا ہے آپ انھیں ایسے امر کی یاددہانی کروا رہے تھے جو بھلا دیا گیا تھا اور شدید دباؤ اور اختناق کی وجہ سے اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اسی لئے آپ نے فرمایا:"**فانی اتخوّف ان یدرس ھذا الامر ویذھب الحق ویغلب**"۔ ''مجھے خوف ہے کہ یہ مسئلہ ختم نہ ہو جائے اور حق جاتا رہے اور مغلوب ہو جائے۔''

معاصر مورخ ڈاکٹر محمد ابراہیم آیتی کے مطابق تحف العقول میں جو خطبہ درج ہے اس کے فقروں کے دروبست اور طرز خطاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی موقع کا ہے۔۲۱اس بات کو واضح کرنے کے لئے ہم اس خطبے سے کچھ اقتسابات نقل کرتے ہیں:سید الشہداء علیہ السلام نے

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں آیات الٰہی سنا کر فرمایا: ''تم علم، بھلائی اور خیر خواہی کے لئے مشہور ہو لوگوں کے دلوں میں تمہاری عظمت ہے شریف تمہارا احترام کرتے ہیں اور کمزور تمہاری عزت کرتے ہیں جن پر تمہارا کوئی احسان نہیں وہ بھی تمہیں اپنے سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں۔''

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ سے بھلائی کے متمنی ہو مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں غضب الٰہی میں گرفتار نہ ہو جاؤ کیونکہ تم خدا کے فضل سے ایسے درجے پر ہو جو دوسروں کو حاصل نہیں تمہاری لوگوں میں عزت ہے لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ خدا سے باندھے ہوئے عہد و پیمان توڑے جا رہے ہیں مگر تمہیں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی حالانکہ اگر کوئی تمہارے آباء سے کیے ہوئے عہدوں کی خلاف ورزی کرے تو تم بے چین ہو جاتے ہو رسول اللہؐ کی امانت کو کوئی پوچھتا نہیں، بستیوں میں اندھے، گونگے، اپاہج پڑے رہتے ہیں، پر کوئی ترس نہیں کھاتا تم اپنی ذمہ داریوں کی پروا نہیں کرتے اور جو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے، ظلم کو نظر انداز کر کے اور ظالموں سے تعاون کر کے اپنے بچاؤ کی فکر کرتے ہو انھیں باتوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا اور دوسروں کو بھی نہی کرنے کا حکم دیا ہے لیکن تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو سب سے زیادہ مصیبت تو تمہاری ہی ہے کیونکہ جو مرتبہ تمہیں ملنا چاہئے تھا اور جو مقام علماء کا حق تھا تم اس سے زبردستی محروم کر دیئے گئے ہو کاش تم سمجھتے۔''

پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: ''دراصل انتظام وانصرام اور اجرائے احکام کا کام علماء کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تھا جو حلال وحرام سے واقف اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کاموں کے نگران ہیں مگر تم سے تمہارا مرتبہ چھین لیا گیا اور یہ اس لئے ہوا کہ تم حق سے دور ہو گئے اور واضح دلائل کے باوجود سنت کے بارے میں تم اختلافات کا شکار ہوا گر تم اپنی ذمہ داری محسوس کرتے اور تکالیف ومصائب پر صبر کرتے تو سب اختیارات تمہارے ہی ہاتھ میں ہوتے لیکن تم نے اپنی جگہ ظالموں کو دے دی اور سب الٰہی امور کا اختیار انھیں سونپ دیا جو مشتبہ طریقوں پر چلتے اور اپنی بیہودہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں وہ اس لئے تم پر مسلط ہو گئے کہ تم موت سے بھاگتے تھے اور تمہیں زندگی عزیز تھی جو ہر حال

میں فنا ہونے والی ہے تم نے کمزور اور ضعیف لوگوں کو انھیں کے حوالے کر دیا ان میں سے کچھ تو بے چارے بالکل غلام بن کر رہ گئے اور کچھ نان جویں کے محتاج ہو کر رہ گئے اب وہ سارے ملک میں من مانی کرتے ہیں اور اپنی خواہشات پر چل کر رسوائی سمیٹتے ہیں برے لوگوں کے طور طریقے اپناتے ہیں اور ذات جبار کے سامنے حیا نہیں کرتے اور اس کی پروا نہیں کرتے ہر علاقے اور شہر میں ان کا خطیب منبر پر چیختا ہے وہ خدا کی زمین کے بلا شرکت غیرے مالک بنے بیٹھے ہیں کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں اور سب لوگ ان کے زیر دست ہیں وہ جس پر ہاتھ ڈالنا چاہیں کوئی انھیں روک ٹوک نہیں سکتا کچھ سرکش ، ہٹ دھرم اور غریبوں کو ستانے والے ہیں کچھ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن سے بیگانے ہیں کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ یہ مملکت ایسے ظالموں کے ہاتھ میں ہے جن کا کام صرف لوٹ کھسوٹ ہے اور ایسے لوگ حاکم بنے بیٹھے ہیں جنہیں مومنوں پر رحم نہیں آتا اب ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف کا فیصلہ اللہ ہی کرے گا۔[۲۱]

یہ خطاب ان لوگوں سے تھا جو عوام میں مقبول اور ممتاز مقام رکھتے تھے اور اس لئے ان کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ تھی مگر وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کر رہے تھے یہاں تک کہ امام علیہ السلام نے ظالموں کے اسلامی معاشرے پر تسلط کا ذمہ دار انھیں افراد کو ٹھہرایا ہے امام علیہ السلام نے انھیں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے اب یہ وہی افراد ہو سکتے ہیں جنھیں آپ نے منیٰ میں دعوت دے کر بلایا تھا اور خطاب فرمایا تھا یہ خطاب مدینے میں مہاجرین وانصار سے نہیں ہو سکتا کیونکہ اولاً حاکم مدینہ کی موجودگی میں ایسا اجتماع ممکن نہیں ثانیاً آپؑ کا اس قسم کی گفتگو کرنا اور حاکم وقت کا معترض نہ ہونا بعید لگتا ہے اور پھر اس کا ذکر تاریخوں میں بھی نہیں ملتا۔ لہذا بعد والے قرائن بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ خطبہ اسی موقعہ پر ارشاد ہوا ہے جس کا ذکر ابتدائے کلام میں ہوا ہے۔

لحن کلام اور خطبے کے مطالب سے ظاہر ہے کہ یہ معاویہ کی وفات کے بعد اور یزید کی بیعت کے معاملہ پیش آنے کے بعد کا نہیں ہے۔ اس خطاب سے چند نکات بڑے واضح طور پر سامنے آتے ہیں:

1-امام حسین علیہ السلام حکومت کے حالات پر بڑی گہری نظر رکھے ہوئے ہیں اوراس کے ظالمانہ کردار کے مضمرات سے پوری طرح آگاہ ہیں اوران معاملات کو اپنی حدتک محدود نہیں رکھا بلکہ اسلامی معاشرے کے سرکردہ افراد کو بھی آگاہ کررہے ہیں اورانھیں موجودہ خطرات سے خبردار کررہے ہیں۔

2- آپؑ آئندہ کے حالات کو بصیرت افروز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور پیش آنے والے واقعہ کے لئے لوگوں کو ذہنی طور پر تیار کررہے ہیں۔

3- آئندہ کے واقعات آئندہ کے قیام کے لئے لوگوں کو آمادہ کرنے کے لئے آپ نے دو چیزوں کو واضح کرنا انتہائی ضروری سمجھا ایک تو اپنا مقام ومرتبہ یاددلایا، اپنی اوراپنے خاندان کی عظمت، فضیلت اوراہمیت کو بیان کیا اور دوسرا موجودہ ظالم حکومت ظلم وجوراورانحرافات کو اجاگر کیا تاکہ لوگ جن کے خلاف قیام کرنا ہے اورجن کی قیادت میں قیام کرنا ہے دونوں کو پہچان لیں۔

4-یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ معاویہ کے دور میں امام علیہ السلام خاموش نہیں بیٹھے بلکہ لوگوں کو بیدار کرتے رہے اورامام علیہ السلام اپنے قیام اورانقلاب کے لئے مناسب وقت کی تلاش میں تھے اس لئے یہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ امام حسین علیہ السلام نے معاویہ کی حکومت کو تسلیم کرلیا تھا اور وہ صرف یزید کی حکومت کے خلاف تھے۔

اب ہم اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ آخر آپ نے معاویہ کی حکومت کے خلاف کیوں قیام نہیں کیا حالانکہ اس نے امام حسن علیہ السلام سے صلح کی کسی شرط پر بھی عمل نہیں کیا؟

اس مختصر مقالے میں شاید ہم ان تمام علل واسباب کا جائزہ نہ لیں سکیں البتہ ایک دو باتوں کی طرف اشارہ ضرور کریں گے: جب ۴۱ھ میں امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کرلی اوراس کے بعد صلح کی شرائط پر عمل نہ کیا بلکہ شرائط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عراق کے شیعیوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا ان میں سے بہت نامور اور صالح ترین افراد جیسے رشید ہجری، عمرو بن حمق خزاعی، جویرہ بن مسہر عبدی، عبداللہ بن یحیٰی حضرمی اوران کے ساتھیوں اوراسی طرح حجر بن عدی کندی اوران کے بھائیوں اورساتھیوں کو قتل کرادیا اورعراق میں ظلم وستم کا بازار گرم کردیا تو کوفے کے معززین اور قبائل

کے زعماء نے اجتماع کیا اور اموی حکومت کے مظالم اور انحرافات پر بحث و گفتگو کی اور صلح کی شرائط کی عدم پاسداری کو زیر بحث لایا نتیجے کے طور پر انھوں نے زعماء کوفہ پر مشتمل ایک وفد مدینہ میں امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں بھیجا تا کہ وہ ان مسائل پر آپ سے گفتگو کرے اور آپ کو معاویہ کے خلاف دوبارہ جنگ کرنے پر آمادہ کریں اور صلح کی شرائط کی مکمل خلاف ورزی پر اسے توڑنے پر قائل کریں اور اگر وہ انکار کریں تو پھر وہ یہی مطالبات لے کر امام حسین علیہ السلام کے پاس جائیں شاید وہ ان کے مطالبات کو مان لیں کیونکہ انھوں نے محسوس کیا کہ امام حسین علیہ السلام معاویہ کے انحرافات اور ظلم وستم پر سخت ناراض اور غصہ میں ہیں۔

چنانچہ وفد کوفہ سے روانہ ہوا مدینہ پہنچا اور پروگرام کے مطابق امام حسن علیہ السلام کے پاس گیا جب انھوں نے اپنی چاہتوں کے مطابق جواب نہ پایا تو وہ امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں آئے تا کہ ان کے ذریعے سے امام حسن علیہ السلام کو معاویہ سے صلح نامہ پر نظر ثانی کے لئے آمادہ کریں یا یہ کہ امام حسین علیہ السلام خود قیام کریں۔ امام حسین علیہ السلام نے انھیں جواب دیا: ''**قد كان صلح و كانت بيعة كنت لها كارهاً، فانتظروا مادام هذا الرجل (يعنى معاويه)حياً ،فان يهلك نظرنا و نظرتم**''. ''صلح ہو چکی ہے اور مجبوراً بیعت ہے ہمارے لئے پس تم انتظار کرو جب تک یہ شخص (یعنی معاویہ) زندہ ہے جب یہ شخص مر جائے تو اس وقت ہم اور آپ دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے؟''[۲۲]

اس جواب کے بعد وہ وفد واپس کوفہ چلا گیا۔ اس کے بعد عراق کے شیعوں اور امام حسین علیہ السلام کے درمیان مسلسل رابطہ رہا اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا اس تمام عرصہ میں آپ انھیں صبر اور انتظار کرنے کی تلقین فرمائی۔ جب ۵۰ھ میں امام حسن علیہ السلام کو زہر سے شہید کر دیا گیا تو عراق کے شیعہ دوبارہ متحرک ہو گئے اور انھوں نے کئی اجتماعات منعقد کیے انھوں نے امام حسین علیہ السلام کو خط لکھا جس میں انھوں نے بھائی امام حسن علیہ السلام کی وفات پر تعزیت کے ساتھ آپ کو صلح کا پیمان توڑنے اور معاویہ کے خلاف قیام کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے لکھا:

''ہم تک حسن بن علیؑ کی رحلت کی خبر پہنچی سلام ہوان پر جس دن وہ پیدا ہوئے جن دن انھوں نے کوچ کیا اور جس دن وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور انھیں اپنے نبی محمدؐ سے ملحق فرمائے اور ان کے مصائب پر ان کے اجر میں اضافہ فرمائے اور ان کے بعد آپؑ کے لئے یہ مصیبت اچھائی میں بدل دے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حساب و کتاب ہے﴿انا للہ وانا الیہ راجعون﴾

اس امت پر اس سے بڑھ کر اور کونسی مصیبت ہوسکتی ہے یہ آپ کے خاص شیعہ ہیں، آپ امیر المؤمنینؑ کے فرزند اور رسول خداؐ کی بیٹی کے بیٹے ہیں، ہدایت کا علم، شہروں کا نور ہیں اور دین کے قائم ہونے کی امید آپ سے ہے صالحین کی سیرت کا اعادہ آپ کے دم سے ہے آپ اس مصیبت پر صبر کریں (اللہ آپ پر رحم فرمائے) کیونکہ صبر کرنا ہی پختہ امور میں سے ہے آپ اپنے سے پہلے والوں کے جانشین ہیں اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے اسے جو آپ کی راہنمائی میں چلتا ہے۔

اور ہم آپ کے شیعہ ہیں جو آپ کی مصیبت پر حزن وملال رکھتے ہیں آپ کے غم سے غم واندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں آپ کی خوشی سے خوش ہوتے ہیں آپ کی سیرت پر چلنے والے ہیں آپ کے حکم کے منتظر ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو شرح صدر دے آپ کے ذکر کو بلند کرے اور آپ کو اجر عظیم عنایت فرمائے آپ کی مغفرت کرے اور آپ کے حق کو آپ کی طرف پلٹا دے۔ والسلام ۲۳

امام حسین علیہ السلام نے ان کا خط پڑھا اور انھیں جواب میں لکھا: ''مجھے پوری امید ہے کہ صلح کے بارے میں میرے بھائی کی رائے اور ظالموں سے جہاد کے بارے میں میری رائے صحیح اور پختہ اور رشد و ہدایت پر مبنی ہے پس فی الحال اپنے آپ کو ظاہر نہ کرو اور زمین سے چمٹے رہو اور ہدایت کا دامن نہ چھوڑو جب تک یہ ھند کا بیٹا زندہ ہے اگر اسے کوئی حادثہ پیش آیا اور میں زندہ ہوا تو انشاء اللہ اپنی رائے اور موقف کا اظہار کروں گا۔'' ۲۴

لیکن عراق کے شیعوں خصوصاً اہل کوفہ نے خطوط اور وفود کا سلسلہ جاری رکھا اور آپ انھیں صبر و تحمل اور معاویہ کی موت کے انتظار کا کہتے رہے۔ آخری وفد مسیّب بن نخبہ کی سربراہی میں کوفہ سے

مدینہ آیا جو معاویہ کے خلاف قیام کا مطالبہ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے: ''ہم آپ کی رائے کو جانتے ہیں اور آپ سے پہلے آپ کے بھائی کی رائے کو بھی۔'' امام حسین علیہ السلام نے انھیں جواب دیا: ''میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو اس کی نیت کی جزا دے گا اور مجھے ظالموں سے جہاد سے میری محبت کی نیت کی جزا دے گا۔''

امام حسین علیہ السلام کے پاس کوفہ کے وفود اور خطوط کا آنا حکمرانوں سے پوشیدہ امر نہ تھا بلکہ حاکم مدینہ مروان بن الحکم نے اس پر معاویہ کو خط بھی لکھا اور اسی کے ردعمل کے طور پر معاویہ نے امام حسین علیہ السلام کو مکتوب لکھا اور اپنے عہد و پیمان اور صلح کی پابندی کی تاکید کی۔ معاویہ امامؑ کو لکھتا ہے: ''میرے پاس آپ کی سرگرمیوں کی خبریں پہنچی ہیں اگر یہ خبریں سچ ہیں تو مجھے آپ سے ایسی توقع نہیں تھی اور اگر یہ خبریں غلط ہیں تو بجا ہے کیونکہ میں ایسی باتوں سے آپ کو بری سمجھتا ہوں جو عہد آپؑ نے خدا سے کیا ہے اسے پورا کریں اور مجھے بھی ایسا کرنے پر مجبور نہ کریں اگر آپ میری اور میری حکومت کی تائید نہیں کریں گے تو میں بھی آپ کو جھٹلانے کی کوشش کروں گا اور اگر مجھ سے چال بازی سے پیش آئیں گے تو میں بھی ایسا ہی کرونگا خدا سے ڈریں اور امت اسلامی کو اختلاف اور فتنہ سے بچائیں۔

امام حسین علیہ السلام نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا: ''اما بعد تمہارا خط ملا تم نے لکھا تھا کہ میرے بارے میں تم تک ایسی خبریں پہنچی ہیں جو بزعم خود میرے لئے زیب نہیں دیتیں اور تیرے نزدیک یہ باتیں میرے شایان شان نہیں ہیں یہ بات ذہن میں رہے کہ نیکی کی ہدایت صرف اللہ ہی دیتا ہے اور وہ باتیں جو میرے بارے میں تم تک پہنچی ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں جو سخن چینی کرنے والوں تفرقہ اندازوں اور اختراع پردازوں کی خود ساختہ ہیں نہ میں نے تمہارے خلاف جنگ کرنے کی تیاری کی ہے اور نہ تمہارے خلاف قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یہ باتیں تمہارے خوف اور تم سے عذر خواہی کے ڈر یا تمہارے ظالم، ملحدین اور بے دین ساتھیوں کے ڈر کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ خوف خدا کی وجہ سے کیا تم ''حجر ابن عدی'' اور اس کے ساتھیوں جو نمازی اور عبادت گزار تھے کے قاتل

نہیں ہو؟ جن کا گناہ صرف یہی تھا کہ انھوں نے ظلم و بدعت کا مقابلہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور راہ خدا میں کسی کی پرواہ نہ کی اور اس کے باوجود تم نے ظلم وستم سے شہید کر دیا جبکہ ان کو امان دی جا چکی تھی اور گذشتہ واقعات کے تحت ان کو اذیت نہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود تم نے ان کے خوان سے ہاتھ رنگے کیا تم رسولؐ کے صحابی ''عمرو ابن حمق'' کے قاتل نہیں ہو؟ کیا اس بندہ صالح کو تم نے امن دینے کے بعد قتل نہیں کیا؟ تو کیا میں وہ شخص نہیں ہو جس نے زیادہ ابن سمیہ کو جو ثقیف کے چند کمینوں کے ہاں پیدا ہوا تھا اپنا بھائی بنالیا۔

جبکہ رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ بچہ اپنے باپ کا ہوگا اور زانی تو سنگسار کیا جائے گا تم نے سنت رسولؐ کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کی اور اللہ کی ہدایت سے انحراف کیا اور اس کے بعد تم نے اس ''زیاد'' کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا ان کے ہاتھ پیر کاٹ دیئے ان کی آنکھیں نکالیں اور ان کو کھجور کے درخت پر سولی دے دی گویا کہ تم اس امت سے نہیں ہو یا اس امت کا تم سے کوئی ربط نہیں ہے کیا تم وہ نہیں ہو جس نے اہل ''خضر موت'' کو علیؑ کے ساتھ محبت کرنے کے جرم میں قتل کر دیا۔

جب سمیہ کے بیٹے نے اطلاع دی کہ اہل خضر موت دین علیؑ کے پیروکار ہیں تم نے اسے نہیں لکھا کہ جو شخص علیؑ کے دین کا پیروکار ہو اسے قتل کر دو سمیعہ کے بیٹے نے تیرے حکم پر ان کو قتل کیا اور ان کو مثلہ کیا حالانکہ علیؑ کا دین رسول اکرمؐ کا دین ہے اور اسی دین کی خاطر علیؑ نے تم کو اور تمہارے باپ کو تہہ تیغ کیا تھا اور اسی دین کے نام سے تو اب حکومت کر رہا ہے معاویہ! تم نے لکھا تھا کہ میں اپنی جان، اپنے دین اور امت محمدؐ کا خیال رکھو اور اس امت میں اختلاف اور فساد نہ کروں میرے نزدیک اس امت پر تیری حکمرانی سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں ہے۔

جب میں اپنی ذمہ داری اپنے دین اور امت محمدؐ کی خاطر سوچتا ہوں تو تم سے لڑنا میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہے معاویہ! تم نے لکھا تھا کہ اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی بدی کی تو تم بھی میرے ساتھ بدی کرو گئے اور اگر میں نے تم سے دشمنی کی تو تم بھی مجھ سے دشمنی کرو گے میں آج تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم سے جس قدر ممکن ہو سکے مجھ سے دشمنی کرو مجھے اطمینان ہے کہ تمہاری دشمنی

میرے لئے کوئی نقصان دہ نہ ہوگی نقصان ہوگا تو تمہیں ہوگا کیونکہ تم جہالت کی سواری پر سوار ہو اور عہد شکنی کے حریص مجھے اپنی جان کی قسم کہ تم نے اپنی کسی شرط پر عمل نہیں کیا صلح، صفائی عہد و میثاق اور امن کے معاہدے کے بعد تم نے کچھ لوگوں کو شہید کر دیا جن کا گناہ صرف یہی تھا کہ وہ ہمارے فضائل کے قائل تھے اور ہماری عظمت بیان کرتے تھے خدا تمہارے ان جرائم کو فراموش نہیں کرے گا اور بے بنیاد الزامات پر ان بندگان صالح کے قتل اور ان کو اپنے گھروں سے نکال کر شہر بدر کرنا ہرگز نہیں بخشے گا۔''

مذکورہ باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے اپنے بھائی حسن بن علی علیہا السلام کے معاویہ کے ساتھ صلح کے پیمان کی مکمل پاسداری کی ہے جب کہ اس کے برعکس معاویہ نے اس کی تمام شرائط کو پس پشت ڈال کر اپنے عزائم اور سازشوں کو جاری رکھا لیکن معاویہ کی خلاف ورزیوں کی نشاندہی کی اور ان پر اس کی خبر بھی لی اس کی بعض تمناؤں کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنے اور اپنے موقف کا برملا اظہار بھی کیا۔ جہاں تک معاویہ کے خلاف قیام کا تعلق ہے اس میں امام علیہ السلام مصلحت نہیں دیکھتے اور اس کے لئے مناسب وقت کے انتظار میں تھے البتہ اپنے قیام کے لئے مسلسل زمین ہموار کرتے رہے۔

اگر امام حسینؑ عہد معاویہ میں قیام فرماتے تو معاویہ امام حسنؑ کی تحریک اور قیام کو بدنام کرنے کے لیے صلح امام حسنؑ سے فائدہ اٹھاتا کیونکہ لوگوں کو پتہ تھا کہ امام حسنؑ نے یہ معاہدہ کیا ہے کہ جب تک معاویہ زندہ ہے وہ سکوت اختیار کریں گے۔

☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

(۱) الارشاد للمفید :باب ذکرالامام الحسن بن علیؑ ، الفصول الہمہ ابن الصباغ المالکی،ص۱۴۵۔ ذخائر العقبیٰ:ص۱۳۹۔عمدۃ الطالب:ص۵۲۔

(۲)ایضاً (۳) تاریخ یعقوبی، ج۲،ص۱۹۲۔ (۴)ایضاً

(۵)انساب الاشرف، بلاذری، ج۳،طبع بیروت۔

(۶)مقتل الحسینؑ ،محمد تقی بحرالعلوم،ص۸۱، بیروت۔

(۷)شرح نہج البلاغہ، ج۴،ص۸۔

(۸)تاریخ عاشورہ، ابراہیم آیتی،ص۲۴۔

(۹)الامامۃ والسیاسۃ، ج۱،ص۱۸۳تا۱۸۲۔

(۱۰)(الامۃ والسیاسۃ، ج۱،ص۱۹۵۔۱۹۶)

(۱۱)انساب الاشراف، ج۳

(۱۲)تاریخ یعقوبی، ج۲،ص۲۰۳۔

(۱۳)مقتل الحسینؑ،۸۰تا۸۸۔

(۱۴)بلاذری کی انساب الاشراف، ج۳،ص۱۵۲،مطبوعہ بیروت۔

(۱۵)انساب الاشراف، ج۲،ص۵۳۔

(۱۶)شرح ابن حدید، ج۴،ص۸۔

(۱۷)امامۃ والسیاسۃ، ج۱،ص۱۷۳۔

(۱۸)الامام الحسین فی مدنیۃ المنورہ ورحلتہ الی مکۃ المکرّمۃ، ج۱،ص۲۵۸۔

(۱۹)الامام حسین فی المدینہ منورہ،ص۲۵۸۔

(۲۰)تاریخ عاشورہ،ص۲۹۔

(۲۱)تحف العقول،ص۲۳۷تا۲۳۹۔

کربلا میں صحابہ رسولؐ کا کردار

حجت الاسلام ثمر علی نقوی

مقدمہ:

حضرت امام حسین علیہ السلام کا انقلاب پوری امت اسلامیہ کی نجات، توحید کی سربلندی اورانسانیت کی آزادی کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن صدافسوس کہ اس انقلاب سے پوری امت اسلامیہ نے وہ فائدہ حاصل نہ کیا جس کے امام حسین علیہ السلام خواہشمند تھے۔اس کی ایک وجہ دشمن کی جانب سے اس مقدس انقلاب کے خلاف مذموم الزام تراشیاں ہیں جن کے ذریعے مقاصد واہداف امام حسینؑ کو غلط رنگ دے کر سادہ لوح مسلمانوں کو اس نور الٰہی سے دور رکھنے کی ناجائز کوشش کی گئی۔بنی امیہ کے حامیوں اورظالم حکومتوں کے آلۂ کار افراد نے انقلاب حسینؑ پر غیر آئینی اقدام کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ اس کی نوعیت خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت اورلشکر کشی کی ہے چنانچہ ''شوکانی''نقل کرتے ہیں:

''کچھ علماء حد سے گذر گئے اوروہ فرزند رسولؐ حضرت امام حسینؑ کے اقدام کو شرابی، نشے باز اورحرمت شریعت مطہرہ کی ہتک کرنے والے یزید بن معاویہ(ان پر خدا کی لعنت ہو) کے خلاف بغاوت سمجھتے ہیں!!''(۱)

اس الزام کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ بات سلف صالح کی روش کے متضاد ہے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت کے علماء،صحابہ،تابعین اورسیاست دان سب اس بات پر متفق تھے کہ حضرت امام حسینؑ حق پر ہیں انھوں نے یزید کے اس غیر انسانی اقدام کی مذمت کی اورکسی نے بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کے اقدام کو خلیفہ المسلمین کے خلاف بغاوت نہیں سمجھا چنانچہ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''اگر چہ ان(حسینؑ) کی زندگی میں اوران کے بعد بھی صحابہ وتابعین میں سے کسی ایک شخص

کا بھی یہ قول ہمیں نہیں ملتا کہ آپؑ کا خروج ناجائز تھا اور وہ ایک فعل حرام کا ارتکاب کرنے جارہے تھے۔''(۲)

ہم ثابت کریں گے کہ صحابہ وتابعین کا مخالفت کرنا تو کجا کثیر تعداد میں صحابہ کرام اور تابعین نے انقلاب حسینؑ کی حمایت کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کردیں بعض مادہ پرست لوگوں نے اس واقعہ کو دو خاندانوں کی جنگ قرار دینے کی مذموم کوشش کی اور بعض افراد نے امام حسینؑ کے مقصد کو''حکومت طلبی'' سے تعبیر کیا ان اعتراضات کے جواب مدلل انداز میں مفصل کتب میں پیش کئے گئے ہیں اس مقالہ میں کوشش کی گئی ہے کہ ان پاکیزہ اذہان جنھیں''حقائق'' کی تلاش رہتی ہے پر ایک خاص زاویہ سے انقلاب امام حسینؑ کے مقدس ہونے اور یزید کی اسلام دشمنی کو واضح کیا جائے۔

امام حسین علیہ السلام ایک فرد نہیں تھے جنہوں نے یزید بن معاویہ کی باطل حکومت کے خلاف قیام کیا بلکہ آپؑ اس مقدس تحریک کے عظیم راہبر تھے جو اس وقت کی باطل ،اسلام دشمنی اور ناجائز حکومت کے خلاف وجود میں آئی امام حسینؑ کو پیغمبر اسلامؐ نے''ہدایت کا چراغ'' قرار دیا تھا:﴿انّ **الحسینؑ مصباح الهدی و سفینة النجاة**﴾اس وقت جب امت گمراہی کی تاریکیوں میں ڈوب رہی تھی امام حسینؑ ہادی وراہنما بن کر ایسی تحریک کا آغاز کرتے ہیں جس کا ہر اسلام خواہ، غیرت منداور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت ومحبت رکھنے والے شخص نے ساتھ دیا۔

ہاں البتہ اس تحریک کی حمایت کرنے والوں کی نوعیت مختلف تھی بعض نے زبانی کلامی حمایت کی اور بعض افراد جن میں اصحاب رسولؐ کی ایک خاص تعداد تھی نے اپنی جان کی بازی لگا کر اس انقلاب کو پائیدار کرنے میں مدد کی۔

امید ہے یہ مقالہ''حق'' کے ہر متلاشی مخصوصاً ان افراد کے لئے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم سے خاص عقیدت ومحبت رکھتے بہترین راہنما ثابت ہوگا اس لئے کہ امام حسینؑ کی پیروی میں صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد نے قربانیاں پیش کی ہیں بعض اصحاب کربلا میں پہنچ کر علی الاعلان یزید کے باطل نظریات کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے بعض کربلا سے قبل کوفہ یا دیگر مقامات پر امام حسین

علیہ السلام کی حمایت کے جرم میں یزیدی کارندوں کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے نیز بعض اصحاب جو کچھ وجوہات کی بنا پر واقعہ کربلا میں شریک نہ ہو سکے تھے امام حسینؑ کی شہادت کے بعد یزید کے مظالم کے خلاف اور امام حسینؑ کی حمایت میں قیام کرتے ہیں اور جانیں قربان کر کے ثابت کرتے ہیں کہ اس راہ میں موت شہادت وسعادت کی موت ہے۔

اس تحریر میں صرف ان اصحاب رسول اللہؐ کے احوال و واقعات کو درج کیا گیا ہے جو کربلا میں نواسۂ رسول اللہؐ کی حمایت کرتے ہوئے شہادت کے مقام پر فائز ہوئے۔شہداء کربلا اصحاب کو مختلف معتبر منابع سے ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے بعض ان صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی درج کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے جو معتبر کتب میں درج نہ تھے یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ ''صحابی'' کی تعریف میں اختلاف نظر کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نظریہ کے مطابق اصحاب کو درج کیا گیا ہے جو صحابی رسولؐ کے مفہوم میں وسعت کا قائل ہے چنانچہ اس نظریہ کے حامی افراد میں ہم صرف ابن حجر عسقلانی کی عبارت کو نقل کرتے ہیں:

''واصحُّ ما وقفت علیه من ذالک انّ الصحابی من لقی النبی صلی الله علیه و آله وسلم مومناً به ومات علی الاسلام ، فیدخل فی من لقیه من طالت مجالسته اوقصرت ، ومن روىٰ عنه اولم یرُو ، ومن غزا معه اولم یغر ومن رأهُ رویةً ولو لم یجالسه ومن لم یرٰه لعارضٍ کالعمی.....''

''صحیح ترین تعریف یہ ہے کہ حالت ایمان میں پیغمبرؐ کی زیارت کرنے والے اور اسلام کی حالت پر فوت ہونے والے کو صحابی کہتے ہیں اس تعریف کے مطابق ہر وہ شخص صحابی ہوگا جو طولانی مدت یا کم مدت پیغمبرؐ کی صحبت میں رہا، جنگ میں شریک ہوا یا نہ، باقاعدہ زیارت کی یا کسی مجبوری (جیسے نابینا ہونے) کی وجہ سے زیارت سے محروم رہا.....''

اسی تعریف کے مطابق شہداء کربلا صحابہ میں بعض ایسے افراد کو بھی ذکر کیا گیا ہے جو ''صحابہ ادراکی'' ہیں یعنی زیادہ مدت پیغمبرؐ کی خدمت میں موجود نہ تھے گرچہ بعض صحابہ ایسے بھی ہیں جو رسول اللہؐ

کے ساتھ غزوات میں شریک ہونے کے باوجود شہادت سے محروم رہے پھر ۶۱ھ میں نواسۂ رسولؐ کا ساتھ دے کر شہادت کی آرزو تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

1-اسلم بن کثیر الازدی(یامسلم بن کثیر):

زیارت ناحیہ میں ان کا نام ''اسلم'' ذکر ہوا ہے جبکہ کتب رجال میں بجائے ''اسلم'' کے ''مسلم بن کثیر الازدی الاعرج'' بیان ہوا ہے زیارت ناحیہ کے جملات یوں ہیں: ''السلام علیٰ اسلم بن کثیر الازدی الاعرج............'' (۴) مرحوم زنجانی نے نقل کرتے ہیں کہ یہ صحابی رسولؐ تھے (۵) مرحوم شیخ طوسیؒ اور مامقانیؒ نے اپنی کتب رجال میں نقل کرتے ہیں کہ جنگ جمل میں تیر لگنے سے پاؤں زخمی ہوگیا تھا جس کی وجہ سے ''اعرج'' (ایک پاؤں سے اپاہج) ہوگئے انھوں نے صحبت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو درک کیا تھا۔

عسقلانی لکھتے ہیں: ''**مسلم بن کثیر بن قلیب الصدفی الازدی الاعرج......الکوفی له ادراک للنبیؐ**'' مزید اضافہ کرتے ہیں فتح مصر میں بھی یہ صحابی رسولؐ حاضر تھے طبری اور ابن شهر آشوب نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کربلا میں حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے۔(۶)

مسلم بن کثیر ''ازد'' قبیلہ کے فرد تھے جب امام حسین علیہ السلام نے مدینہ سے ہجرت کی تو ان دنوں یہ صحابی رسولؐ کوفہ میں قیام پذیر تھے یہی وجہ ہے امام حسین علیہ السلام کو کوفہ میں آنے کی دعوت دینے والوں میں یہ شامل ہیں پھر حضرت مسلم بن عقیلؑ جب کوفہ میں سفیر حسینؑ بن کر پہنچے تو انھوں نے حضرت مسلم بن عقیل کی حمایت کی لیکن حضرت مسلمؑ کی شہادت کے بعد کوفہ کو ترک کیا اور کربلا کے نزدیک حضرت امام حسین علیہ السلام سے جاملے اور پہلے حملہ میں جام شہادت نوش کیا۔(۷)

حضرت رسول اکرمؐ نے اپنے اس صحابی کے متعلق جو ایک جنگ میں ''اعرج'' ہونے کے باوجود شریک ہوئے اور اپنی جان کی قربانی پیش کی فرمایا: ''والذی نفسی بیده لقد رأیت عمرو بن الجموح یطأً فی الجنه بعرجته............'' یعنی مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے دیکھ

رہا ہوں عمرو بن الجموح کو کہ لنگڑا ہو کر بھی جنت میں ٹہل رہا ہے اس بنا پر حضرت مسلم بن کثیر کا بھی وہی مقام ہے کہ اگرچہ قرآن فرماتا ہے: ﴿**لیس علی الاعمی حرج و لا علی الاعرج حرج**﴾ (۸) یعنی جہاد میں شرکت نہ کرنے میں اندھے پر کوئی حرج نہیں اور نہ ہی لنگڑے پر کوئی مؤاخذہ ہے لیکن اس فدا کار اسلام نے نواسہ رسولؐ کی حمایت میں اپنی اس اپاہج حالت کے باوجود جان قربان کر کے ثابت کیا کہ اسلام کے تحفظ کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہئے یہی وجہ ہے ''صاحب تنقیح المقال'' کے یہ جملے ہیں: ''**شهید الطف غنی عن التوثیق**'' فرماتے ہیں چونکہ کربلا کے شہداء میں شامل لہذا وثاقت کی بحث سے بے نیاز ہیں۔

2-انس بن حارث:

حضرت پیغمبرؐ کے صحابی تھے جنگ بدر وحنین میں شرکت بھی کی (۹) مرحوم مامقانی فرماتے ہیں: ''(**انس**) **بن حارث صحابی نال بالطف الشهادة**'' (۱۰) (صحابی رسولؐ تھے اور کربلا میں شہادت کے مقام پر فائز ہوئے) ابن عبدالبر اپنی کتاب الاستیعاب میں یوں رقمطراز ہیں ''انس بن حارث روی عنہ والد اشعث بن سلیم عن النبیؐ فی قتل الحسین وقتل مع الحسین رضی اللہ عنہما'' (۱۱)

''انس بن حارث کے واسطہ سے اشعث بن سلیم کے والد نے نبی اکرمؐ سے امام حسینؑ کی شہادت سے متعلق روایت نقل کی ہے کہ یہ (انس بن حارث) حضرت حسینؑ کے ہمراہ شہید ہوئے۔''

الاستیعاب نے جس روایت کا ذکر کیا ہے وہ یوں ہے کہ حضرت انس بن حارث نے رسول خدا (ص) سے سنا تھا کہ آپؐ نے فرمایا: ''میرا بیٹا (حسین) کربلا کی سرزمین پر قتل کیا جائے گا جو شخص اس وقت زندہ ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ میرے بیٹے کی مدد ونصرت کو پہنچے۔'' روای کہتا ہے کہ انس بن حارث نے پیغمبرؐ کے اس فرمان پر لبیک کہتے ہوئے کربلا میں شرکت کی اور امام حسینؑ کے قدموں پر اپنی جان نچھاور کر دی۔ (۱۲)

اس حدیث نبویؐ کی اہمیت کے پیش نظر ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے کامل سند کے ساتھ ذکر کر دیا جائے: ''**سعد (سعید) بن عبدالملک بن واقد الحرانی بن عطا بن مسلم**

الخقاف عن اشعث بن سلیم عن ابیه قال سمعت انس بن حارث یقول:سمعت رسول اللهؐ یقول:ان ابنی هذا(یعنی الحسین)یُقتل بارض یقال لها کربلا فمن شهد منکم فلینصره.''

قال(العسقلانی):''فخرج انس بن الحرث الی کربلا فقتل مع الحسین.''

صاحب فرسان نے ابن عساکر سے یوں نقل کیا ہے:''**وقال ابن عساکر انس بن الحرث کان صحابیاً کبیرا ممن رأی النبیؐ وسمع حدیثه وذکره عبدالرحمٰن السلمی فی اصحاب الصفه.....**''(۱۳)

''ابن عساکر لکھتے ہیں کہ انس بن الحرث ان عظیم اصحاب رسولؐ میں سے تھے جنھیں حضرت پیغمبرؐ کی زیارت نصیب ہوئی انھوں نے آپؐ سے حدیث بھی سنی تھی عبدالرحمٰن سلمی نے انھیں اصحاب صفہ میں شمار کیا ہے.....''

حضرت انس کا ذکر تمام معتبر منابع میں مختلف عناوین سے موجود ہے مثلاً انس بن حارث کاھلی (۱۴) انس بن ابی سحیم (۱۵) مکمل ترجمہ یہ ہے:''انس بن حارث بن نبیہ بن کاھل بن عمرو بن مصعب بن اسد بن حزیمہ اسدی کاھلی'' واقعہ کربلا کے دوران کوفہ میں زندگی بسر کررہے تھے یا بعض کے بقول مکہ میں مقیم تھے جب حضرت امام حسینؑ کا معلوم ہوا کہ عراق میں وارد ہوچکے ہیں تو رات (۱۶) کے وقت اپنی اقامتگاہ سے نکل پڑے اور عاشقانہ انداز میں اپنے مولا امام حسینؑ سے جاملے۔

بلاذری لکھتے ہیں کہ حضرت انس کوفہ سے نکل پڑے ایک مقام پر امام حسینؑ اور عبیداللہ بن حر جعفی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی فوراً امام حسینؑ کی خدمت حاضر ہوئے اور قسم کھانے کے بعد عرض کی'' کوفہ سے نکلتے وقت میری نیت یہ تھی کہ عبیداللہ بن حر کی طرح کسی کا ساتھ نہ دونگا (نہ امامؑ کا نہ دشمن کا) یعنی جنگ سے اجتناب کرونگا لیکن خدواند نے میری مدد فرمائی کہ آپؑ کی مدد ونصرت کرنے کو میرے دل میں ڈال دیا اور مجھے جرأت نصیب فرمائی تا کہ اس حق کے راستے میں آپؑ کا ساتھ

دوں۔'' حضرت امام حسین علیہ السلام نے انھیں ہدایت اور سلامتی ایمان کی نوید سنائی اور انھیں اپنے ساتھ لے لیا۔(۱۷)

یہ صحابی رسولؐ نواسۂ رسولؐ کے دشمنوں سے جنگ کرنے کی غرض سے کربلا میں موجود ہیں حضرت امام حسینؑ نے اپنے اس وفادار ساتھی کو یہ ذمہ داری سونپی کہ عمر بن سعد کو حضرتؑ کا پیغام پہنچائے اور اس ملعون کو نصیحت کرے کہ شاید وہ ہوش میں آجائے اور قتل حسینؑ سے باز رہے جب حضرت انس، عمر بن سعد کے پاس پہنچے تو اس کو سلام نہ کیا عمر بن سعد نے اعتراض کیا کہ مجھے سلام کیوں نہیں کیا، آیا تو مجھے کافر اور منکر خدا سمجھتا ہے؟ حضرت انس نے فرمایا: ''تو کیسے منکر خدا اور رسولؐ نہ ہو جبکہ تو فرزند رسولؐ کے خون بہانے کا عزم کر چکا ہے!'' یہ جملہ سن کر عمر بن سعد سر نیچے کر لیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ میں بھی جانتا ہوں کہ اس گروہ (گروہ حسینؑ) کا قاتل جہنم میں جائے گا لیکن عبیداللہ بن زیاد کے حکم کی اطاعت ضروری ہے۔(۱۸)

ابتدائے ملاقات سے حضرت انس تکلیف دہ حالات اپنی نظروں سے دیکھ رہے تھے لہذا جب دشمن کی طرف سے جنگ شروع ہوئی تو حضرت انسؓ بھی دیگر اصحاب حسین علیہ السلام کی طرح حضرت امامؑ سے اجازت طلب کر کے عازم میدان ہوئے یہ مجاہد جوان نہیں تھا گو ایمان جوان تھا نقل کرتے ہیں کہ حضرت انس کی حالت یہ تھی کہ سن پیری (بڑھاپے) کی وجہ سے خمیدہ (جھکی ہوئی) کمر کو شال (رومال) سے باندھ کر سیدھا کرتے ہیں، سفید ابرو، آنکھوں پر پڑ رہے تھے، رومال پیشانی پر باندھ کر اپنی آنکھوں سے ان بالوں کو ہٹاتے ہیں اور میدان کارزار میں روانہ ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ نے جب اپنے اس بوڑھے صحابی کو دیکھا تو حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا: ''خدا تجھ سے یہ قربانی قبول کرے اے پیر مرد۔''(۱۹)

ہر مجاہد جنگ کرتے وقت رجز (مجاہدانہ اشعار) پڑھا کرتا تھا جو رجز حضرت انس نے پڑھا ہے نہایت پر معنی تھا پہلے اپنا تعارف کرایا پھر کہا:

''واستقلبوا لقوم بغرٍ الآن آل علی شیعة الرحمٰن، و آل حرب شیعة

الشیطان''(۲۰)

کاہل ودان نسب جانتے ہیں کہ میرا قبیلہ دشمن کو نابود کرنے والا ہے اے میری قوم شیر غراں کی طرح دشمن کے مقابلے میں جنگ کرو کیونکہ آل علیؑ رحمان کے پیروکار جبکہ آل حرب (بنوسفیان) شیطان کے پیروکار ہیں۔ بڑھاپے کے باوجود سخت جنگ کی ۱۲ یا ۱۸ دشمنوں کو قتل کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا زیارت ناحیہ کے جملات یہ ہیں:''**السلام علی انس بن الکاهل الاسدی**''(۲۱)

3-بکر بن حی:

علامہ سماوی نے اپنی کتاب ابصار العین میں حدایق الوردیہ سے نقل کیا ہے کہ'' بکر بن حی'' کوفہ سے عمر بن سعد کے لشکر میں شامل ہوکر کربلا پہنچا لیکن جب جنگ شروع ہونے لگی تو حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر عمر بن سعد کے خلاف جنگ کرتے ہوئے پہلے حملے میں شہید ہوگئے منتھی الآمال میں ان کا ذکر ان شہداء میں موجود ہے جو حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔(۲۲) تنقیح المقال نے'' بکر بن حی'' کو شہدائے کربلا میں شمار کیا ہے عبارت یوں ہے:'' بکر بن حی من شهد الطف بحکم الوثاقة'' ابن حجر عسقلانی نے'' بکر بن حی'' کے ترجمہ میں لکھا ہے:''**بکر بن حی بن علی تمیم بن ثعلبه بن شهاب بن لام الطائی.....له ادراک ولولده مسعود ذکر بالکوفه فی زمان الحجاج و کان فارساً شجاعاً.....**''(۲۳)

(بکر بن حی..... نے حضرت پیغمبرؐ کے محضر مبارک کو درک کیا اور ان کے بیٹے مسعود کے بارے میں ملتا ہے کہ حجاج بن یوسف کے زمانے میں کوفہ میں مقیم تھا۔)

''الاصابہ''میں'' بکر بن حی'' کے صحابی رسولؐ ہونے کی گواہی ملتی ہے گو بیان نہیں کیا کہ یہ صحابی کربلا میں شہید ہوئے یا نہ؟ لیکن دیگر منابع رجال ومقاتل میں انھیں شہدائے کربلا میں شمار کیا گیا ہے۔

4-جابر بن عروہ غفاری:

کتاب ''شہدائے کربلا'' میں بیان ہوا ہے کہ متاخرین کے نزدیک یہ صحابی رسول خداؐ تھے جو کربلا میں شہید ہوئے جنگ بدر اور دیگر غزوات میں رسول اکرمؐ کے ہمراہ شریک ہوئے یہ بوڑھے صحابی روز عاشورا رومال باندھ کر اپنے ابروؤں کو آنکھوں سے ہٹاتے ہیں اور عازم میدان جنگ ہوتے ہیں جب امام علیہ السلام کی نظر پڑی تو فرمایا: اے پیرمرد! خدا تجھے اجر دے۔''(۲۴)

ذبیح اللہ محلاتی نے مقتل خوارزمی سے درج ذیل عبارت نقل کی ہے: ''**ثم یرز جابر بن عروة الغفاری و کان شیخاً کبیراً وقد شهد مع رسول الله بدراً او حنیناً وجعل یشد وسطه بعمامعته ثم شدحاجبیه بعصابته حتی رفعهما عن عینیه والحسینؑ ینظر الیه وهویقول شکر الله سعیک یاشیخ فحمل فلم یزل یقاتل حتی قتل ستین رجلاً ثم استشهد رضی الله عنه**''(۲۵)

بعض کتب جیسے تنقیح المقال، مقتل ابی مخنف اور وسیلۃ الدارین میں صحابی رسولؐ اور شہید کربلا کے عنوان سے بیان ہوا ہے البتہ دیگر معتبر منابع میں ان کا ذکر موجود نہیں اس وجہ سے بعض محققین ان کے بارے میں مردد ہیں۔ ''تنقیح'' کے جملات یہ ہیں'' جابر بن عمیر الانصاری، صحانی مجھول''(۲۶) جبکہ وسیلۃ الدارین کی عبارت کے مطابق یہ صحابی رسول تھے اور جنگ بدر کے علاوہ دیگر جنگوں میں بھی شریک رہے۔

''**انّ جابر بن عروه کان اصحاب رسول اللهؐ یوم بدر وغیرها......**''(۲۷) جب دشمن کے مقابلہ میں آئے تو یہ رجز پڑھا:

قد علمت حقاً بنو غفار	**وخندف ثم بنو نزار**
ینصرنا لاحمدمختار	**یاقوم حاموا عن بنی الاطهار**
الطیبین السادة الاخیار	**صلی علهم خالق الابرار**

''یہ بنوغفار وخندف نزار قبائل جانتے ہیں کہ ہم یاور محمد مصطفیؐ ہیں اے لوگو آل اطہارؑ جو سید وسردار ہیں ان کی حمایت کرو کیونکہ خالق ابرار نے بھی ان پر درود وسلام بھیجا ہے۔''

ان الفاظ کے ساتھ دشمن پر آخری حجت تمام کرتے ہوئے چند افراد کو واصل جہنم کرنے کے بعد جام شہادت نوش کیا۔(۲۸)

5-جنادة بن كعب الانصاری:

جنادہ بن کعب وہ صحابی رسولؐ ہیں جو حضرت امام حسینؑ کی نصرت کے لئے کربلا میں اپنی زوجہ اور کم سن فرزند کے ساتھ شریک ہوئے خود کو اپنے بیٹے سمیت نواسۂ رسولؐ کے قدموں پر قربان کر دیا علامہ رسولی محلاتی نقل کرتے ہیں جنادہ صحابی رسول خداؐ اور حضرت علی علیہ السلام کے مخلص شیعہ تھے جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے ساتھ شریک ہوئے (۲۹) اور کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل کے لئے بیعت لینے والوں میں شامل تھے حالات خراب ہونے کی وجہ سے کوفہ کو ترک کیا اور امام حسینؑ سے جا ملے۔

تنقیح المقال نے جنادہ کے ترجمہ کو اس طرح بیان کیا ہے: ''**جنادة بن (كعب) بن الحرث السلمانی الازدی الانصاری الخزرجی من شهداء الطف.....وقدذكر اهل السير انه كان من اصحاب رسول اللهؐ .....**''(۳۰)

صاحب کتاب فرسان نے تاریخ ابن عساکر کے حوالے سے نقل کیا ہے: ابن مسعود روایت کرتے ہیں'' حضرت پیغمبر اکرمؐ نے جنادۃ بن الحارث کو ایک مکتوب میں بیان فرمایا کہ یہ مکتوب محمد رسول اللہؐ کی جانب سے جنادہ اور اس کی قوم نیز ہر اس شخص کے لئے ہے جو اس کی پیروی کرے گا کہ نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کریں جو اس حکم پر عمل کرے گا خدا اور رسولؐ کی حفظ وامان میں رہے گا۔''(۳۱) اس فدا کار صحابی رسولؐ نے اپنے راہبر کے حکم پر عمل کر کے نہ فقط مال کی زکوۃ ادا کی بلکہ اپنی جان اور اولاد کی زکوۃ بھی دیتے ہوئے دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کر لی حضرت جنادہ کی زوجہ ''مسعود خزرجی'' کی بیٹی اور بڑی شجاع وفدا کار خاتون تھی جب جنادہ شہید ہو چکے تو اس مجاہدہ عورت نے اپنے خوردسال بیٹے عمرو بن جنادہ کو (جو گیارہ یا نو سال (۳۲) کی عمر میں تھا) کو حکم دیا کہ جاؤ جہاد کرو یہ باادب بچہ ماں کی اجازت کے باوجود اپنے مولا و آقا

حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں آیا اور بڑے احترام سے عرض کی مجھے جہاد کی اجازت عطا فرمائیں۔حضرتؑ نے اجازت دینے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ شاید تیری ماں راضی نہ ہو(کیونکہ تیرا سن چھوٹا ہے اور تیری ماں بوڑھی ہے) یہ جملات سننے تھے کہ اس ننھے مجاہد نے عرض کی کہ ''انّ امّی قد امرتنی'' (میری ماں تو مجھے اجازت دے چکی ہیں) میری ماں نے نہ فقط اجازت دی ہے بلکہ مجھے لباس جنگ اس نے خود پہنایا ہے اور حکم دیا ہے آپؑ پر جان قربان کردوں امام حسینؑ نے جب اس کا جذبۂ جہاد دیکھا تو اجازت دی میدان جنگ میں آ کر صحابی رسولؐ کے اس کمسن فرزند نے اپنا تعارف بڑے نرالے انداز میں کرایا خلاف معمول اپنا نام یا والد اور قبیلہ کا ذکر نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ اس کمسن بچے کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے کہ یہ کس کا فرزند ہے بعض کتب میں یہ جملہ ملتا ہے کہ ''خرج شاب قتل ابوہ فی المعرکۃ'' (۳۳) دشمن کو للکار کر کہتا ہے:

امیری حسینٌ و نعم الامیر	**سرور فواد البشیر النذیر**
علیٌ و فاطمه و الداه	**فهل تعلمون له من نظیر**
له طلعة مثل شمس الضحیٰ	**له غُرّه مثل بدر المنیر (۳۴)**

''میرے آقا و سردار اور بہترین سردار حسینؑ ہیں بشیر النذیر (پیغمبر اکرمؐ) کے دل کا چین ہیں علیؑ و فاطمہؑ جس کے والدین ہوں کیا اس کی مثال (دنیا میں) کہیں مل سکتی ہے؟ چمکتے سورج کی مانند نور افشانی کرنے والا اور چودھویں کے چاند کی مانند (تاریکیوں میں) روشنی دینے والا راہنما امام ہیں۔''

میدان جنگ میں شہید ہو جانے کے بعد دشمن نے سر جدا کر کے ماں کی طرف پھینکا ماں نے سر اٹھا کر کہا: ''مرحبا اے نور عین'' اور پھر دشمن کو دے مارا اور عمود خیمہ اٹھا کر دشمن کی فوج پر حملہ کرنا چاہا لیکن حضرت امام حسینؑ نے واپس بلا لیا اور اس باوفا خاتون کے حق میں دعا فرمائی۔حضرت جنادہ کا نام بعض منابع میں ''جابر'' (۳۵) یا ''جبار'' یا ''جیاد'' درج ہوا ہے ان کے والد کے نام کو بھی بعض نے ''حارث'' (۳۶) اور بعض نے ''حرث'' (۳۷) ذکر کیا جبکہ قاموس (۳۸) میں ''جنادہ'' کے نام سے موجود ہے

ان کے قبیلہ کا نام ''سلمانی''(۳۹) یا ''سلمانی ازدی''(۴۰) بیان ہوا ہے یہ صحابی رسولؐ ''عذیت الھجانات'' کے مقام پر امام حسینؑ کے حضور شرفیاب ہوئے اسی دوران ''حر'' امام حسینؑ کا راستہ روک کر انھیں گرفتار کرنا چاہتا تھا جبکہ امامؑ کی شدید مخالفت کی وجہ سے اس کام سے باز رہا امام علیہ السلام ان تازہ شامل ہونے والے افراد (جیسے جنادہ بن حارث) کے ذریعے کوفہ کے حالات سے مطلع ہوئے اس وقت سے لے کر روز عاشور تک ساتھ رہے صبح عاشور جنادہ بعض دیگر افراد کے ساتھ تلوار ہاتھ میں لے کر دشمن کے لشکر پر حملہ آور ہوئے دشمن کے نرغہ میں جانے کی وجہ سے تمام افراد ایک مقام پر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔(۴۱) زیارت رجبیہ وناحیہ میں ان پر ''سلام'' ذکر ہوا ہے۔

6-جندب بن حجیر الخولانی الکوفی:

''جندب بن حجیر کندی خولانی'' یا ''جندب بن حجر''(۴۲) پیغمبر اکرمؐ کے عظیم صحابی اور اہل کوفہ میں سے تھے یہ ان افراد میں سے ہیں جنھیں حضرت عثمان نے کوفہ سے شام بھیجا تھا جنگ صفین میں بھی شرکت کی اور حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے قبیلہ ''کندہ اور ازد'' کے لشکر کے سپہ سالار مقرر ہوئے اور واقعہ کربلا میں امام حسینؑ کے ہمرکاب جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔(۴۳)

صاحب وسیلۃ الدارین لکھتے ہیں: ''**قال ابن عساکر فی تاریخه هو جندب بن حجیر بن جندب بن زهیر بن الحارث بن کثیر بن جثم بن حجیر الکندی الخولانی الکوفی یقال له صحبة مع رسول الله وهو من اهل الکوفه وشهد مع النبیؐ.....وقال علماء السیر ومنهم الطبری: انه قاتل جندب بن حجیر بین یدیه الحسینؑ حتی قتل فی اول القتال.....**''(۴۴)

مندرجہ بالا ترجمہ کے مطابق یہ صحابی رسولؐ اور شہدائے کربلا میں سے تھے۔

جندب بن حجیر کے صحابی رسولؐ ہونے میں اتفاق ہے لیکن مقام شہادت میں اختلاف ہے ابن عساکر انھیں جنگ صفین کے شہداء میں ذکر کرتے ہیں۔(۴۵) لیکن بعض دیگر معتبر منابع انھیں شہدائے کربلا میں شمار کرتے ہیں تنقیح المقال میں ان کا ترجمہ اس طرح ہے:

''.....شهد الطف.....وعده الشيخ من رجاله من اصحاب الحسينؑ واقول هو جندب بن حجير الكندى الخولانى الكوفى وذكر اهل السير انّ له صحبة و.....''(۴۶)

نیز رجال طوسی ''اقبال'' اور ''اعیان الشیعہ'' میں بھی شہدائے کربلا کی فہرست میں ذکر کیا گیا ہے۔(۴۷)

جندب کوفہ کے نامدار اور معروف شیعہ افراد سے تعلق رکھتے تھے کوفہ کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے وہاں سے نکل پڑے عراق میں حر کا لشکر پہنچنے سے قبل حضرت امام حسینؑ سے مقام ''حاجر'' میں ملاقات کی اور امامؑ کے ہمراہ وارد کربلا ہوئے جب روز عاشور (عمر سعد کی طرف سے) جنگ شروع ہوئی یہ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے پہلے حملہ میں مقام شہادت پر فائز ہوئے۔(۴۸)

7-حبیب بن مظاهر الاسدی:

خاندان بنی اسد کے معروف فرد حضرت رسول اکرمؐ کے صحابی اور امام علی، امام حسن و امام حسین علیہم السلام کے وفادار ساتھی تھے(۴۹) عسقلانی ان کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ''حبيب بن مظاهر بن رئاب بن الاشتر.....الاسدى كان صحابياً له ادراک وعمر حتى قتل مع الحسينؑ يوم الطف مع ابن عمه ربية بن خوط بن رئاب مكنى اباثور''(۵۰)

معتبر منابع میں ان کے حالات زندگی اور کربلا میں جہاد کا ذکر مفصل ملتا ہے حبیب بن مظاہر حضرت علی علیہ السلام کے شاگرد خاص اور وفادار صحابی تھے اپنے مولا علیؑ کے ساتھ کئی جنگوں میں شرکت کی بہت سے علوم پر دسترس تھی زہد و تقویٰ کے مالک تھے ان کا شمار پارسان شب اور شیران روز میں ہوتا ہے ہر شب ختم قرآن کرتے تھے۔(۵۱)

صاحب رجال کشی (اختیار معرفۃ الرجال)، فضیل بن زبیر کے حوالہ سے حضرت حبیب بن مظاہر اور میثم تمار کے مابین ہونے والے مکالمے کو نقل کرتے ہیں جس میں یہ دونوں حضرات اپنی شہادت سے متعلق پیش آنے والے حالات سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی

علیہ السلام کے یہ تربیت شدہ شاگرد ''علم باطن'' اور ''علم بلایا ومنایا'' (آئندہ آنے والی مشکلات ومصائب) پر کس قدر تسلط رکھتے تھے تفصیلی مکالمہ ملاحظہ ہو۔ ''رجال کشی ص ۷۸''

حضرت حبیب بن مظاہر کا شمار راویان حدیث میں بھی ہوتا ہے روایت میں ہے کہ حبیب ایک مرتبہ امام حسینؑ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ حضرات قبل از خلقت آدمؑ کس صورت میں تھے؟ حضرت امام حسینؑ نے فرمایا: ''ہم نور کی مانند تھے اور عرش الٰہی کے گرد طواف کر رہے تھے اور فرشتوں کو تسبیح وتمجید وتھلیل سکھاتے تھے۔ (۵۲)

حضرت حبیب ان افراد میں شامل تھے جنھوں نے سب سے پہلے امام حسینؑ کو کوفہ آنے کی دعوت دی (۵۳) پھر جب حضرت مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو سب سے پہلا شخص جس نے حضرت مسلم کی حمایت اور وفاداری کا اعلان کیا عابس بن ابی شبیب شاکری تھے اس کے بعد حبیب بن مظاہر کھڑے ہوئے اور عابس شاکری کی بات کی تائید کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے: ''خدا تم پر رحم کرے کہ تو نے بہترین انداز میں مختصر الفاظ کے ساتھ اپنے دل کا حال بیان کر دیا خدا کی قسم میں بھی اسی نظریہ پر پختہ یقین رکھتا ہوں جیسے عابس نے بیان کیا ہے۔ (۵۴)

اس طرح حبیب حضرت مسلم کے بہترین حامی تھے اور مسلم بن عوسجہ کے ساتھ مل کر حضرت مسلم بن عقیل کے لئے لوگوں سے بیعت لیتے تھے (۵۵) لیکن جناب مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد اہل کوفہ کی بے وفائی کی وجہ سے ان کے قبیلہ والوں نے مجبوراً ان دونوں (حبیب اور مسلم بن عوسجہ) کو مخفی کر دیا لیکن جونہی حبیب بن مظاہر کو امام حسین علیہ السلام کے کربلا پہنچنے کی خبر ملی تو رات کے وقت سے فائدہ اٹھا کر حضرتؑ سے جا ملے حالت یہ تھی کہ دن کو مخفی ہو جاتے اور رات کو سفر کرتے یہاں تک کہ اپنی دلی آرزو کو پا لیا۔ (۵۶)

اگر چہ بعض منابع نے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کو جب جناب مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملی تو آپؑ نے حبیب بن مظاہر کو خط لکھ کر بلایا (۵۷) لیکن یہ مطلب معتبر ذرائع کی رو سے ثابت نہیں۔ (۵۸)

کربلا پہنچنے کے بعد جب عمر سعد کے لشکر میں اضافہ ہوتا دیکھا تو امامؑ سے اجازت لے کر اپنے قبیلہ ''بنی اسد'' کے پاس گئے اور مفصل خطاب کے بعد انھیں امام حسینؑ کی مدد و نصرت کے لئے درخواست کی جس کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے: ''.....میں تمہارے لئے بہترین تحفہ لایا ہوں وہ یہ کہ درخواست کرتا ہوں فرزند رسولؐ کی مدد کے لئے تیار ہو جاؤ.....نواسۂ رسولؐ آج عمر سعد کے بائیس ہزار لشکر کے محاصرہ میں ہے آپ لوگ میرے ہم قبیلہ ہیں میری بات پر توجہ کریں تا کہ دنیا و آخرت کی سعادت تمہیں نصیب ہو سکے خدا کی قسم تم میں سے جو بھی فرزند رسول خداؐ کے قدموں میں جان قربان کرے گا مقام اعلیٰ علیین پر حضرت رسول خداؐ کے ساتھ محشور ہوگا۔(۵۹) حضرت حبیب کی تقریر اتنی موثر تھی کہ بہت سے لوگوں نے اس آواز پر لبیک کہا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ و تیار ہو گئے لیکن ''ارزق بن حرب صیدادی'' ملعون نے چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ ان افراد پر حملہ کر کے انھیں منتشر کر دیا حبیب نے یہ اطلاع حضرت امامؑ کو پہنچائی جب حضرت امام حسینؑ اپنے خدا سے راز و نیاز کرنے کے لئے عصر تاسوعا (نہم محرم) کو دشمن سے مہلت طلب کی تو اس دوران ''حبیب'' نے لشکر عمر سعد کو موعظہ و نصیحت کرتے ہوئے کہا: ''خدا کی قسم! کتنی بری قوم ہوگی کہ جب فردائے قیامت اپنے پیغمبرؐ کے حضور حاضر ہوں گے تو ایسے حال میں کہ اسی رسولؐ کے نواسہ اور ان کے یار و انصار کے خون سے اس کے ہاتھ آلودہ ہوں گے۔''

شہادت کی موت سے محبت کا یہ عالم ہے کہ جب شب عاشورا اپنے ساتھ ''یزید بن حصین'' سے مزاح کرتے ہیں تو یزید بن حصین نے کہا کہ یہ کیسا وقت ہے مزاح کا جبکہ ہم دشمن کے محاصرے میں ہیں اور ہم موت کے منہ میں جانے والے ہیں تو حبیب نے کہا اے دوست اس سے بہتر کونسا خوشی کا وقت ہوگا جبکہ ہم بہت جلد اپنے دشمن کے ہاتھوں شہید ہو کر بہشت میں پہنچنے والے ہیں۔(۶۰)

ایک روایت کے مطابق شب عاشور جب ہلال بن نافع نے حبیب بن مظاہر کو بتایا کہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا پریشان ہیں کہ میرے بھائی حسینؑ کے صحابی کہیں بے وفائی نہ کر جائیں تو آپ تمام اصحاب کو جمع کر کے درخیمہ پر لائے اور حضرت زینبؑ کی خدمت میں صمیم دل سے اظہار وفاداری کیا اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کا دوبارہ عہد کیا تا کہ حضرت زینبؑ کی یہ پریشانی ختم

ہو سکے۔(۶۱)

صبح روز عاشور حضرت امام حسینؑ نے اپنے لشکر کو منظّم کیا دائیں طرف موجود لشکر کی کمانڈ زہیر بن قین اور بائیں طرف حبیب بن مظاہر جبکہ قلب لشکر کی سربراہی حضرت ابوالفضل العباسؑ کے سپرد کی اسی اثنا میں دشمن کے سپاہی وارد میدان ہوکر مبارزہ طلب کرتے ہیں تو حبیب مقابلہ کے لئے آمادہ ہوئے لیکن حضرت امامؑ نے روک لیا اس طرح ظہر عاشور جب امامؑ نے لشکر عمر سعد سے نماز ادا کرنے کی خاطر جنگ بندی کے لئے کہا تو ایک ملعون نے گستاخی کرتے ہوئے کیا کہ تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی (نعوذ باللہ) اس وقت حضرت حبیب سے برداشت نہ ہوا اور فوراً یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے ''اے حمار (گدھے)! تیرے خیال باطل میں آل پیغمبرؐ کی نماز قبول نہیں؟! اور تمہاری نماز قبول ہے؟!!'' اس طرح دونوں کا مقابلہ ہوا حبیب نے اس ملعون کو زمین پر گرادیا پھر باقاعدہ رجز پڑھتے ہوئے وارد میدان ہوئے شدید جنگ کی دشمن کے کئی افراد کو واصل جہنم کیا لیکن ایک تیمی شخص نے تلوار کا وار کیا جس کی تاب نہ لاکر آپ شہید ہوگئے اس نے آپ کے سر کو جدا کرلیا اسی سر کو بعد میں گھوڑے کی گردن میں باندھ کر کوفہ میں پھرایا گیا گویا کوفہ کا نامور مجاہد اہل کوفہ سے یہ کہہ رہا تھا دیکھو یہ سر آل رسولؐ کی خاطر کٹ سکتا ہے لیکن دشمن کے سامنے جھک نہیں سکتا (۶۲) السلام علیک یا حبیب بن مظاھر الاسدی۔

8-زاھر بن عمرو الاسلمی:

''زاھر'' شجاع اور بہادر شخص تھے صحابی رسولؐ اور اصحاب شجرہ میں سے تھے اور محبین اہل بیت علیہم السلام میں ان کا شمار ہوتا ہے حضرت رسول خداؐ کے ہمراہ غزوہ حدیبیہ اور جنگ خیبر میں شریک ہوئے۔

ذبیح اللہ محلاتی وسیلۃ الدارین کی عبارت نقل کرتے ہیں: ''**قال العسقلانی فی الاصابه هوزاهر بن عمرو بن الاسود بن حجاج بن قیس الاسدی الکندی من اصحاب الشجرة وسکن الکوفه وروی عن النبیؐ وشهدالحدیبیه وخیبر ....**''(۶۳)

''............زاھر درحقیقت زاھر بن عمرو......الکندی ہیں جو اصحاب شجرہ میں سے تھے کوفہ میں مقیم

تھے اور حضرت رسول خداؐ سے روایت بھی نقل کی ہے حدیبیہ اور خیبر میں شریک تھے۔''

ان کے بیٹے ''مجزأۃ'' نے اپنے باپ کے واسطہ سے پیغمبر اکرمؐ سے روایت بیان کی ہے فوق الذکر مطلب مختصر فرق کے ساتھ دیگر منابع میں بھی موجود ہے (۶۴) لیکن بعض محققین کے خیال میں زاھر اور زاھر اسلمی دو الگ الگ افراد ہیں۔ (۶۵)

البتہ تنقیح کی عبارت میں انھیں اصحاب شجرہ اور شہدائے کربلا میں شمار کیا گیا ہے'' **زاھر اسلمی والدمجزأة من اصحاب الشجرہ**'' نیز فرماتے ہیں: ''**زاھر صاحب عمرو بن الحمق شھید الطف فوق الوثاقہ وعدہ الشیخ فی رجالہ من اصحاب ابی عبداللہ واقول ھوزاھر بن عمرو الاسلمی الکندی من اصحاب الشجرہ روی عن النبیؐ وشھد الحدیبیہ وخیبر وکان من اصحاب عمربن الحمق الخزاعی کمانص علی ذالک اھل السیرو.....**'' (۶۶)

مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''زاھر'' نام کے دو اشخاص ہیں لیکن مرحوم مامقانی کی نظر میں زاھر بن عمرو اسلمی کا شمار اصحاب شجرہ اور شہدائے کربلا میں ہونا ثابت ہے نیز بیان کرتے ہیں کہ یہ محبّ اہل بیتؑ تھے بہت بڑا تجربہ کار پہلوان اور بہادر شخص تھا امام علیؑ کی شہادت کے بعد ''عمر بن حمق'' کے ساتھ مل کر معاویہ کی ظالمانہ حکومت اور ابن زیاد کے خلاف برسر پیکار رہا جب معاویہ نے ان کی گرفتاری اور قتل کا حکم صادر کیا تو یہ دونوں شہر سے فرار کر گئے پہاڑوں اور جنگلوں میں زندگی بسر کرنے لگے یہاں تک کہ ''عمرو بن حمق'' حکومتی کارندوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد شہید کر دیا گیا لیکن زاھر زندہ رہا آخر کار ۶۰ھ میں حج کے موقعہ پر امام حسینؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوا اور آپؑ کے ساتھ مل کر کربلا کی جنگ میں شرکت کی عاشورا کے دن پہلے حملے میں جام شہادت نوش کیا۔ (۶۷) زیارت ناحیہ اور رجبیہ میں سلام ان الفاظ میں ذکر ہوا السلام علی زاھر مولیٰ عمرو بن حمق (۶۸)

9-زیاد بن عریب ابوعمرو:

قدیم محققین نے ان سے متعلق کوئی مطلب بیان نہیں کیا لیکن بعض معاصر نے ان کا ترجمہ

اس طرح درج کیا ہے: ''**زیاد بن عریب بن حنظلہ بن دارم بن عبداللہ بن کعب الصائدبن همدان**'' (۶۹) ابوعمرو زیاد بن عریب نے حضرت پیغمبرؐ کے محضر مبارک کو درک کیا ان کے والد بزرگوار بھی صحابی رسول تھے ابوعمرو شجاع، عابد و زاھد اور شب زندہ دار شخص تھے زیادہ نماز گزار تھے زہد و تقویٰ کی وجہ سے عزت دینی نے آرام سے نہ بیٹھنے دیا لہذا واقعہ کربلا میں اپنا کردار ادا کرنے کی غرض سے حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچے اور دشمن کے خلاف جہاد و مبارزہ کرنے کے بعد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ (۷۰)

10-سعد بن الحارث مولی امیر المؤمنینؑ:

سعد بن حرث خزاعی کے نام سے معروف ہیں قدیم منابع میں ان کا نام شہدائے کربلا کی فہرست میں ذکر نہیں لیکن بعض متاخرین نے شہید کربلا کے عنوان سے ان کے حالات زندگی قلمبند کیے ہیں سعد بن حرث خزاعی نے محضر پیغمبر اکرمؐ کو درک کیا اس لحاظ سے صحابی رسولؐ ہیں پھر امیر المؤمنینؑ کے ہمراہ رہے حضرت نے انھیں کچھ عرصہ کے لئے سپاہ کوفہ کی ریاست سونپی تھی نیز کچھ مدت کے لئے انھیں آذربائیجان کا گورنر بھی منصوب کیا صاحب فرسان نے ''حدایق الوردیہ''، ''ابصار العین''، ''تنقیح المقال'' اور ''الاصابہ'' جیسی معتبر کتب سے ان کے حالات نقل کیے ہیں۔ (۷۱) نیز الاصابہ سے سعد کا ترجمہ یوں نقل کیا ہے لیکن الاصابہ میں مراجع کرنے سے یہ مطلب نہیں ملا۔

''**سعید بدل سعد بن الحارث بن شاربه بن مرة بن عمران بن ریاح بن سالم بن غاضر بن حبشه بن کنجب الخزاعی مولیٰ علی بن ابی طالبؑ له ادارک و کان علی شرطةٍ علیؑ فی الکوفه و ولاة آذربایجان .....**'' (۷۲)

وسیلۃ الدارین نے بھی ص ۱۲۸ پر صحابی اور شہید کربلا کے عنوان سے ذکر کیا ہے تنقیح المقال کی عبارت میں بھی اس طرح موجود ہے:

''**سعد بن الحارث الخزاعی مولیٰ امیر المؤمنین صحابی امامی شهید الطف ثقه**'' مزید لکھتے ہیں کہ **سعد بن الحارث له ادراک الصحبة النبیؐ و کان علی**

شرطة امیر المؤمنین فی الکوفه وولاة آذربائیجان(۷۳)

مذید تفصیلات ان کتب میں موجود نہیں البتہ اتنا ضرور ملتا ہے کہ ''سعد'' امیرالمؤمنینؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسن وامام حسینؑ کا ہر میدان میں یارومددگار رہا جب حضرت امام حسینؑ نے قیام کیا تو ابتداء میں اپنے مولا کی خدمت میں مکہ میں جا ملے پھر مکہ سے کربلا آئے اور روز عاشور جنگ کرتے ہوئے جان قربان کردی۔(۷۴)

اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ ''مرحوم محقق شوشتری'' نے اپنی کتاب میں ان کے صحابی ہونے پر تنقید کی ہے اس دلیل کی بنا پر کہ اگر صحابی ہوتے تو قدیم منابع نے کیوں ذکر نہیں کیا(۷۵) لیکن مذکورہ بالا بعض معتبر منابع میں ان کا ذکر صحابی رسولؐ ہونے کے عنوان سے آجانا ہمارے مطلب کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

11-شبیب بن عبداللہ مولیٰ الحرث:

''شبیب بن عبداللہ بن شکل بن حی بن جدیہ'' حضرت رسول اکرمؐ کے صحابی اور کوفہ کی معروف ومشہور شخصیت اور بڑے بافضیلت انسان تھے(۷۶) جہاں بھی ظلم وستم دیکھا اس کے خاتمہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے یہی وجہ ہے کہ جنگ جمل وصفین ونہروان میں بھی شرکت کی اور حضرت علیؑ کے وفادار یارومددگار رہے(۷۷)

مختلف معتبر منابع میں ان کا ذکر موجود ہے جیسے ''رجال طوسی''، ''استرآبادی''، ''تنقیح''، ''مقتل ابی مخنف''، ''تاریخ طبری'' وغیرہ۔ ''تنقیح'' میں ان کا ترجمہ اس طرح درج ہے:

''شبیب بن عبداللہ مولی الحرث صحابی شہید الطف، فوق الوثاقۃ'' شبیب سیف بن حارث اور مالک بن عبداللہ کے ہمراہ کربلا پہنچے اور اپنے مولا امام حسینؑ کی اطاعت میں جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ کتاب روضۃ الشہداء ص ۲۹۵ میں ان پر سلام نقل ہوا ہے: السلام علی شبیب بن عبداللہ مولیٰ بن سریع۔

12-شوذب بن عبداللہ الھمدانی الشاکری:

جناب شوذب صحابی رسول اور حضرت علیؑ کے باوفا ساتھی تھے مرحوم ''زنجانی'' نے علامہ'' مامقانی'' سے ان کا ترجمہ نقل کیا ہے:''**ذکر العلامہ مامقانی فی رجالہ شوذب بن عبداللہ الھمدانی الشاکری ان بعض من لایحصل لہ ترجمہ تخیل انّہ شوذب مولی عابس والحال ان مقامہ اجل من عابس من حیث العلم والتقویٰ وکان شوذب صحابیاً واشترک مع امیر المؤمنینؑ .....**''(۷۸)

شوذب علم وتقویٰ کے اعتبار سے بلند پایہ شخصیت تھے کوفہ کی معروف علمی شخصیت ہونے کی وجہ سے اہل کوفہ کے لئے حضرت امیر المومنینؑ کی احادیث نقل کرتے تھے امام علیؑ کے ساتھ تینوں جنگوں میں شریک رہے۔

جب حضرت مسلم بن عقیل کوفہ میں پہنچے تو ان کی بیعت کرنے کے بعد حضرت امام حسینؑ تک اہل کوفہ کے مذید خطوط پہنچانے میں عابس شاکری کے ہمراہ رہے۔نہایت مخلص اور عابد وزاھد انسان تھے بڑھاپے کے عالم میں بھی ظلم کے خلاف عملی کردار ادا کیا کوفہ میں حضرت مسلم کی شہادت کے بعد عابس شاکری کے ہمراہ حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں کربلا پہنچتے ہیں جب حنظلہ بن سعد شبامی شہید ہوگئے تو عابس نے شوذب سے پوچھا کہ کیا خیال ہے؟ کہتے ہیں تیرے ہمراہ فرزند رسول خداؐ کی نصرت کے لئے جنگ کرنا چاہتا ہوں تا کہ شہادت کا مقام حاصل کرسکوں عابس نے کہا اگر یہ ارادہ ہے تو امامؑ کے پاس جا کر اجازت طلب کرو حضرت امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوکر اجازت جہاد حاصل کی اور وارد جنگ ہوئے چند دشمنوں کو واصل جہنم کیا آخر میں شہید ہوگئے(۷۹) ان الفاظ میں زیارت رجبیہ اور زیارت ناحیہ میں ان پر سلام بھیجا گیا ہے السلام علی شوذب مولی شاکر(۸۰)

قابل توجہ امر یہ ہے کہ بعض خیال کرتے ہیں کہ ''شوذب''،''عابس شاکر'' کے غلام تھے جبکہ اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ لفظ مولی صرف غلام کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ''ہم پیمان'' کے معنی بھی استعمال کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے لکھا ہے کہ چونکہ شوذب مقام علمی ومعنوی کے اعتبار سے عابس پر برتری رکھتے تھے لہذا انھیں غلام عابس نہیں کہہ سکتے بلکہ عابس اور اس کے قبیلہ

کے ہم پیمان وہم عہد تھے(۸۱) یہی دلیل علامہ مامقانی سے نقل شدہ ترجمہ میں بیان کی گئی ہے۔

13-عبدالرحمٰن الارحبی:

حضرت رسول اکرمؐ کے بزرگ صحابی تھے تمام معتبر منابع میں ان کا ذکر موجود ہے جیسے ''رجال شیخ طوسی''،'' رجال استرآبادی''،'' مامقانی''، نیز ''الاستیعاب''،'' الاصابہ'' اور''وسیلۃ الدارین'' نے بھی نقل کیا ہے تاریخ طبری اور الفتوح میں ان کے بعض واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔

''الاستیعاب'' کی عبارت اس طرح ہے:''.....**هو عبدالرحمن بن عبدالله بن الكدن الارحبی**.....''**انه كان من اصحاب النبیؐ له هجرة**.....

معاویہ بن ابی سفیان کی وفات کی خبر جب کوفہ پہنچی تو کچھ لوگ ''سلمان بن صرد خزاعی'' کے گھر جمع ہوئے تا کہ اجتماعی طور پر حضرت امام حسینؑ کو خط لکھ کر دعوت دیں اور خلافت کو ان کے سپرد کریں نیز کوفہ کے گورنر نعمان بن بشیر کو کوفہ سے باہر نکال دیں ان خطوط کو''قیس مسہر صیداوی''، عبدالرحمٰن ارجبی اور عمارۃ بن عبداللہ السلولی لے کر حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں ہوئے اس طرح یہ گروہ دوم تھا جو حضرتؑ کو دعوت دینے کے لئے آیا کیونکہ پہلا گروہ عبداللہ بن سمیع کی قیادت میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

عبدالرحمٰن ارجبی شجاع تجربہ کار فاصل اور فصیح وبلیغ صحابی تھے (۸۲)۵۰ یا ۵۳(۸۳) دعوت نامے لے کر ۱۲ رمضان المبارک ۶۰ھ کو مکہ کی طرف روانہ ہوئے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن ارجبی ۱۵۰ افراد پر مشتمل ایک وفد کے ہمراہ حضرت امام حسینؑ کی خدمت اقدس میں پہنچے۔(۸۴)

مکہ میں حضرت امامؑ کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا پھر حضرت کے نمائندہ خاص جناب امیر مسلم کے لئے کوفہ میں انقلابی سرگرمیوں میں مشغول رہے کوفہ میں حالات خراب ہونے کے بعد کربلا میں دشمنان دین کے خلاف جنگ میں شرکت کی جب عمر بن سعد نے امام حسینؑ کے قتل کا پختہ ارادہ کرلیا تو اس صحابی رسولؐ نے اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اپنے مولا وآقا کی حمایت کا اعلان کیا اپنی

شجاعت کے کارنامے دکھانے کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے ذریعے بھی حسین ابن علیؑ کی حقانیت اور بنوامیہ کے بطلان کو اپنے اشعار میں واضح کیا تاریخ میں اس وفادار صحابی کے جو رجز بیان ہوئے ہیں اس زمانہ کی بہترین عکاسی کرتے ہیں کیونکہ بنوامیہ نے اسلام کے نام پر اسلام کی نابودی کا تہیہ کر رکھا تھا اس لئے وہ اصحاب کرام جواب پیغمبر اکرمؐ کے قول و فعل کے ذریعے حقیقی اسلام کے راہبر کی شناخت کر چکے تھے آج دشمنان دین کو اسلام کے حقیقی راہبر کی اطاعت و فرمانبرداری کی طرف دعوت دینا اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں عبدالرحمن کے رجز کا ایک مصرعہ یوں ہے:

انی لمن ینکرنی ابن الکدن　　انی علی دین حسین و حسن (۸۵)

اس طرح امام حسینؑ کو ''دین حق'' کا علمبردار سمجھتے ہوئے ان کے قدموں میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اس شہید باوفا پر زیارت ناحیہ میں ان الفاظ میں سلام پیش کیا گیا ہے: **السلام علی عبدالرحمٰن بن عبدالله بن کدر الارحبی (۸۶)**

14-عبدالرحمٰن بن عبدربه الخزرجی:

مختلف منابع نے ان کے لئے صحابی رسولؐ ہونے کی گواہی دی ہے انھیں بعض نے انصاری بھی لکھا ہے اصل میں مدینہ میں مقیم تھے جب پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ میں ہجرت فرمائی تو اوس و خزرج قبائل نے اسلام قبول کیا اس وقت سے ان سب کو انصاری کہا جاتا تھا صاحب قاموس الرجال نقل کرتے ہیں کہ **''عبدالرحمٰن بن عبدربه الانصاری الخزرجی کان صحابیاً له ترجمة وروية و کان من مخلص اصحاب امیر المؤمنین علیه السلام''** (صحابی رسولؐ تھے جن سے روایت بھی نقل ہوئی ہے اور حضرت امیر علیہ السلام کے مخلص اصحاب میں سے تھے)

جس روایت کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ درحقیقت ''غدیر خم'' کے مقام پر پیغمبر اسلامؐ کی جانب سے ولایت علیؑ کا واضح اعلان کرنا ہے پھر جب وفات پیغمبرؐ کے بعد اکثر افراد جن میں بعض نے دنیاوی مقاصد اور بعض نے خوف کی وجہ سے علی علیہ السلام خلیفۂ بلافصل تسلیم نہ کیا تو ایک مرتبہ رحبہ کے مقام حضرت علیؑ نے لوگوں کو قسم دے کر پوچھا کہ جس نے پیغمبرؐ سے میرے بارے میں کوئی حدیث فضیلت

سنی ہوتو بلند ہوکر بیان کرے اسی اثنا میں عبدالرحمٰن خاموش نہ بیٹھ سکے اور اٹھ کر کہا کہ میں نے غدیر خم کے مقام پر رسول خداؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ فرمایا:"**من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ**" (جس جس کا میں مولا وسردار ہوں اس کا یہ علیؑ مولا وسردار ہے)

مناسب ہوگا کہ الاصابہ فی تمیز الصحابہ کی عبارت نقل کی جائے العسقلانی یوں رقمطراز ہیں:

''**عبدالرحمٰن بن عبدرب الانصاری ذکرہ ابن عقدہ فی کتاب المولاۃفی من روی حدیث:من کنت مولاہ فعلیٌّ مولاہ وساق من طریق الاصبغ بن نباتہ قال لما نشدعلیٌّ الناس فی الرحبہ من سمع النبیؐ یقول یوم غدیر خم ماقال الاقام ، ولایقوم الامن سمع ، فقام بضعۃ عشررجلاً منھم :"ابوایوب"،" ابوزینب" و"عبدالرحمٰن بن عبدرب" فقالوا نشھد انا سمعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یقول "ان اللہ ولی وانا ولی المومنین ؛فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ**"(۸۷)

اس عظیم محقق کی عبارت کے مطابق دس سے زیادہ افراد کھڑے ہوئے اور گواہی دی کہ ہم نے سنا تھا کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: بے شک اللہ ولی ہے میں بھی مومنین کا ولی ہوں پس جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے۔

ابصار العین نے بھی بیان کیا ہے کہ "**کان ھذا صحابیاً وعلمہ امیر المؤمنین القرآن ورباہ وھو احدرواۃ حدیث من کنت مولاہ.....حین طلب علیہ السلام.....**"

یعنی یہ صحابی پیغمبرؐ تھے حضرت علیؑ نے ان کی تربیت کی اور انھیں قرآن مجید کی تعلیم دی اور من کنت مولاہ کی حدیث کو اس صحابی نے اس وقت بیان کیا جب حضرت علیؑ نے گواہی طلب کی تھی(۸۸)

پیغمبرؐ کی وفات کے بعد کوفہ میں سکونت اختیار کر لی اور کوفہ کی معروف شخصیت تھے یہی وجہ ہے کہ کوفہ میں امام حسینؑ کے لئے لوگوں سے بیعت طلب کرتے تھے لیکن جب کوفہ میں امام حسینؑ کے

لئے راہ ہموار کرنے میں ناکام ہوئے تو کربلا میں امامؑ سے ملحق ہوکر دشمن کیخلاف جنگ لڑتے ہوئے پہلے حملہ میں یا بعد از ظہر (۸۹) شہید ہوگئے۔

15-عبداللہ بن حارث بن عبدالمطلب:

کتاب ''شہدائے کربلا'' نے درج ذیل عبارت ''الاصابہ'' سے نقل کی ہے: ''ابوالھیاج عبداللہ بن ابی سفیان بن حارث بن عبدالمطلب بن ھاشم الھاشمی (۹۰) لیکن جب مراجع کیا تو ہمارے ہاں موجود ''الاصابہ'' کی عبارت اس طرح تھی: ''**عبداللہ بن الحارث بن عبدالمطلب بن ھاشم الھاشمی ابن عم النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و کان اسمہ عبدشمس فغیرہ النبیؐ**(۹۱)

ان کا باپ حضرت رسول اکرمؐ کا عموزاد اور برادر رضاعی تھا یہ صحابی رسولؐ، عظیم شاعر بھی تھے اور انھوں نے پیغمبرؐ سے روایت بھی نقل کی ہے اپنے بعض اشعار میں حضرت علیؑ کی مدح وثنا بھی بیان کی ہے۔

حضرت رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد امام علیؑ کے ساتھ رہے انھیں کے ہمرکاب مختلف جنگوں میں شرکت کی ایک مرتبہ جب حضرت عبداللہ کو علم ہوا کہ عمرو عاص نے بنی ھاشم پر طعن وتشنیع اور عیب جوئی کی ہے تو عمرو عاص پر سخت غصہ ہوئے اور اسے موردعتاب قرار دیا آخر تک اہل بیتؑ کے ہمراہ رہے کربلا میں جب حضرت امام حسینؑ کا معلوم ہوا تو ان کی خدمت میں پہنچ کر اپنی وفاداری کا عملی ثبوت دیا۔ اس طرح عاشور کے دن رسول خداؐ کے نواسہ کی حمایت کرتے ہوئے یزیدی فوج کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔(۹۲)

16-عمرو بن ضبیعۃ:

مختلف منابع رجال ومقاتل میں ذکر ہوا ہے کہ یہ صحابی پیغمبرؐ تھے اور کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے ہمرکاب شہادت پائی۔ کتاب فرسان میں الاصابہ سے نقل کیا گیا ہے کہ

''**ھوعمروبن ضبیعۃ بن قیس بن ثعلبہ الضبعی التمیمی لہ ذکرفی المغازی.....**''

نیز ''رجال استر آبادی'' سے بھی نقل کرتے ہوئے یوں بیان ہوا ہے: ''**قال المحقق استر آبادی فی رجاله هو عمرو بن ضبیعه.....و کان فارساً شجاعاً له ادراک** (۹۳)

جناب مامقانی نے بھی انھیں صحابی ادرا کی نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ تجربہ کار اور ماہر جنگجو شخص تھا کئی ایک جنگوں میں شرکت کی نیز شجاعت میں شہرت رکھتا تھا (۹۴)

ابتدا میں عمر سعد کے لشکر کے ساتھ وارد کربلا ہوا لیکن جب دیکھا کہ عمر سعد نواسہ رسولؐ کے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو فوراً حضرت امام حسینؑ کے ساتھ ملحق ہو گئے حملہ اولیٰ میں شہادت پائی زیارت ناحیہ میں عمر کے نام سے ذکر ہوا ہے: **السلام علی عمر بن ضبیعه الضجی** (۹۵)

17-عون بن جعفر طیار:

کنیت ابوالقاسم ہے حضرت جعفر بن ابیطالبؑ کے بیٹے ہیں اگر چہ سن ولادت واضح بیان نہیں ہوا لیکن چونکہ واقعہ کربلا میں ۵۴ یا ۵۷ سال کے تھے لہذا امکان ہے کہ ۴ھ یا ۵ھ کو حبشہ میں ولادت ہوئی ہوگی۔

یعقوبی کے نقل کے مطابق حضرت رسول اکرمؐ نے جنگ موتہ میں حضرت جعفر طیار کی شہادت کے بعد سال ہشتم ہجری میں عون اور ان کے بھائی عبداللہ و محمد کو اپنی گود میں بٹھایا اور پیار کرتے رہے (۹۶) ایک روایت کے مطابق رسول اکرمؐ نے حضرت جعفر طیار کے بیٹوں کو بلایا اور سلمانی کو بلا کر کہا کہ ان بچوں کے سر کی اصلاح کرے اور پھر فرمایا: عون خلقت اور اخلاق میں میری شبیہ ہے الاصابہ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے (۹۷)

جناب عون کا شمار حضرت علیؑ کے یار و انصار میں ہوتا ہے حضرت علیؑ کے ہمراہ جنگوں میں بھی شریک رہے حضرت ام کلثومؑ (حضرت زینب صغری) کا عقد حضرت علیؑ نے عون سے کر دیا (۹۸)

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ہمیشہ امام حسن و حسین علیہما السلام کے ساتھ رہے یہاں تک کہ جب حضرت امام حسینؑ یزید بن معاویہ کے مظالم کی وجہ سے مدینہ سے روانہ ہوئے حضرت عون بھی اپنی زوجہ محترمہ کے ہمراہ اپنے مولا کے اس جہاد میں شریک رہے اور روز عاشور حضرت علی اکبرؑ کی

شہادت کے بعد حضرت امامؑ کی اجازت سے وارد میدان ہوئے ۳۰ سوار اور ۱۸ پیادہ سپاہ یزید کو واصل جہنم کیا لیکن زید رقاد جہنمی نے آپ کے گھوڑے کو زخمی کر دیا جس کی وجہ سے آپ گھوڑے پر نہ سنبھل سکے پھر اس ملعون نے تلوار کا وار کر کے شہید کر دیا۔

ان کے رجز کو تاریخ نے یوں نقل کیا ہے:

ان تنکرونی فانا بن جعفر　　شهید صدق فی الجنان ازهر

یطیر فیها بجناح اخضر　　کفی بهذا شرفاً فی المحشر (۹۹)

18-کنانہ بن عتیق:

جناب کنانہ کوفہ کے شجاع اور متقی و پرہیز گار افراد میں سے تھے اور ان کا شمار قاریان کوفہ میں ہوتا ہے (۱۰۰)

جناب کنانہ اور ان کا باپ عتیق حضرت رسول اکرمؐ کے ہمرکاب جنگ احد میں شریک ہوئے (۱۰۱) وسیلۃ الدارین نے کنانہ کے ترجمہ کو رجال ابوعلی سے یوں نقل کیا ہے:

''قال ابوعلی فی رجاله کنانة بن عتیق الثعلبی من اصحاب الحسینؑ قتل معه بکربلا وقال العسقلانی فی الاصابه هو کنانة بن عتیق بن معاویه بن الصامت بن قیس الثعلبی الکوفی شهداء احداً هوو ابوه عتیق فارس رسول الله(ص) وقدذکره ابن منذه فی تاریخه.....''(۱۰۲)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ''جناب کنانہ'' بھی ان اصحاب رسول خداؐ میں سے ہیں جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی مدد و نصرت کے لئے کربلا تشریف لائے اور اپنی جانوں کو نواسہ رسولؐ کے قدموں میں نچھاور کیا زیارت رجبیہ اور ناحیہ میں ان پر سلام پیش کیا گیا ہے: **السلام علی کنانة بن عتیق (۱۰۳)**

19-مجمّع بن زیاد جهنّی:

حضرت رسول اکرمؐ کے اصحاب میں سے تھے جنگ بدر و احد میں شریک رہے مختلف منابع

نے ان کو صحابی رسولؐ اور شہید کربلا کے عنوان سے ذکر کیا ہے جیسے ذخیرۃ الدارین، حدایق، ابصار العین تنقیح المقال، اور وسیلۃ الدارین وغیرہ

کتاب ''الدوافع الذابیۃ'' نے ''الاستعیاب'' سے عبارت نقل کی ہے کہ'' **ھو مجمّع بن زیاد بن عمرو بن عدی بن عمرو بن رفاعه بن کلب بن مودعة الجهنی شهدا بدراً واحداً**

اس کے عبارت کے نقل کرنے کے بعد خود تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ **اَی انّہ صحابیؓ جلیل بناءً علی ذالک**.....

تنقیح المقال نے بھی الاصابہ اور الاستعیاب سے اس طرح کی عبارت نقل کی ہے کہ یہ صحابی رسولؐ تھے بدر واحد میں شریک بھی رہے لیکن ہمارے ہاں موجود الاصابہ میں یہ عبارت موجود نہیں۔

بہر حال جناب مجمع نے کوفہ میں حضرت مسلم کی بیعت کی سب لوگ حضرت مسلم کو چھوڑ گئے لیکن حضرت مجمع ان افراد میں سے تھے جو ڈٹے رہے اور کوفہ میں حالات سازگار نہ ہونے کیوجہ سے کربلا میں حضرت امام حسینؑ سے ملحق ہوکر یزیدی ارادوں کو خاک میں ملانے کی خاطر حضرت امام حسینؑ کا ساتھ دیا یہاں تک کہ اپنی جان قربان کردی دشمن کربلا میں اس مجاہد کو آسانی سے شکست نہ دے سکا تو ان کا محاصرہ کرلیا جاتا ہے جس کی وجہ سے شہید ہوجاتے ہیں۔(۱۰۴)

20-مسلم بن عوسجہ:

شیعہ وسنی کے تمام معتبر ترین منابع جیسے الاستعیاب، الاصابہ، طبقات بن سعد، تنقیح، تاریخ طبری وغیرہ میں ان کا ذکر موجود ہے کہ یہ صحابی رسول خداؐ تھے اور صدر اسلام کے بزرگ اعراب میں شمار ہوتے تھے ابتدائے اسلام کی بہت سی جنگوں میں شریک رہے غزوہ آذربائیجان اور جنگ جمل وصفین ونہروان میں بھی شرکت کی حضرت علیؑ کے باوفا یار ومددگار تھے(۱۰۵) نیز مختلف صفات کے مالک بھی تھے شجاع وبہادر ہونے کے ساتھ ساتھ قاری قرآن، عالم علوم اور متقی وپرہیزگار، باوفا اور شریف انسان تھے۔(۱۰۶)

حضرت مسلم بن عقیل کے کوفہ وارد ہوتے ہی ان کی مدد ونصرت میں پیش پیش تھے اوران کی حمایت میں لوگوں سے بیعت لیتے تھے نیز مجاہدین کے لئے اسلحہ کی فراہمی اور دیگر امدادی کاروائیوں میں مصروف رہے(۱۰۷)

حضرت مسلم وجناب ہانی بن عروہ کی شہادت کے بعد مخفی طور پر رات کے وقت اپنی زوجہ کو ساتھ لے کر حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچے سات یا آٹھ محرم کو مسلم کوفہ سے کربلا پہنچ گئے اور سپاہ یزید کے خلاف ہر مقام پر پیش پیش رہے۔جب امامؑ نے حکم دیا کہ خیمہ کے اطراف میں آگ روشن کی جائے تو شمر ملعون نے آکر توہین آمیز جملات کہے جس پر مسلم بن عوسجہ نے حضرت امام حسینؑ سے عرض کی کہ اگر اجازت دیں تو اسے ایک تیر سے ڈھیر کردوں لیکن حضرتؑ نے فرمایا نہیں کیونکہ میں پسند نہیں کرتا کہ ہماری طرف سے جنگ کا آغاز ہو۔(۱۰۸)

شب عاشور جس وقت امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو چلے جانے کی اجازت دی تو جہاں بعض دیگر اصحاب امامؑ نے اپنی وفاداری کا یقین دلایا وہاں حضرت مسلم بن عوسجہ نے جو تاثرات بیان کئے وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں عرض کی:''خدا کی قسم!ہرگز نہیں چھوڑ کے جاؤں گا یہاں تک کہ اپنے نیزہ کو دشمن کے سینہ میں توڑ نہ دوں' خدا کی قسم اگر ستر بار مجھے قتل کر دیا جائے پھر جلا کر راکھ کر دیا جائے اور ذرہ ذرہ ہو جاؤں پھر اگر زندہ کیا جاؤں تو بھی آپؑ سے جدا نہیں ہونگا.....یہاں تک کہ ہر بار آپؑ پر اپنی جان قربان کرونگا اس لئے کہ جان تو ایک ہی جائے گی لیکن عزت ابدی مل جائے گی۔''(۱۰۹)

حضرت مسلم بن عوسجہ عظیم صحابی رسولؐ وامامؑ ہیں کہ جن کو حضرت امام حسینؑ نے ایک آیت قرآنی کا مصداق قرار دیا جب مسلم بن عوسجہ پچاس دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد شہید ہو گئے تو حضرت امامؑ فوراً ان کی لاش پر پہنچے اور فرمایا:''خدا تم پر رحمت کرے اے مسلمؑ''پھر سورۂ احزاب کی آیت۲۳ کی تلاوت کی:﴿**فمنهم من قضٰى نحبه ومنهم من ينتظر ومابدلوا تبديلاً**﴾اس طرح امامؑ نے اپنے نانا رسول اللہؐ کے صحابی کو الوداع کہا:السلام علی مسلم بن عوسجہ الاسدی.....**وكنت**

اول من اشتری نفسه و اول شهید شهدالله

21-نعیم بن عجلان:

ایک روایت کے مطابق نعیم اوران کے دو بھائیوں نظر ونعمان نے حضرت رسول اکرمؐ کو درک کیا اس طرح یہ صحابی ادرکی ہیں خزرح قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے حضرت رسول اللہؐ کی وفات کے بعد امام علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ صفین میں حضرت کا ساتھ دیا حضرت علیؑ نے ان کے بھائی نعمان کو بحرین کے علاقے کا والی بنایا(۱۱۰)

نعیم کے دونوں بھائی حضرت امام حسنؑ کے زمانہ میں انتقال کر گئے جبکہ نعیم کوفہ میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ مطلع ہوئے کہ حضرت امام حسینؑ عراق میں وارد ہو چکے ہیں کوفہ کو ترک کرتے ہیں اور حضرت امامؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر غیرت دینی کا عملی ثبوت پیش کرتے ہیں اور نواسۂ رسولؐ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے سپاہ یزید کے خلاف جنگ میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی قربان کر دیتے ہیں۔(۱۱۱) کتاب مناقب کے مطابق روز عاشور اولین حملہ میں جام شہادت نوش کیا ۔(۱۱۲) زیارت ناحیہ اور رجبیہ میں ان پر سلام ذکر ہوا ہے: **السلام علی نعیم بن العجلان الانصاری**(۱۱۳)

☆☆☆☆

حوالہ جات:

(۱) نیل الاوطار، ج ۷، ص ۱۲۷ از ثورۃ العین ص ۳۲۔

(۲) خلافت وملوکیت، ص ۱۷۹۔

(۳) الاصابہ فی تمیز الصحابہ۔ ج ۱۔ ص ۶۔

(۴) اقبال الاعمال، ج ۳، ص ۷۹۔

(۵) وسیلۃ الدارین، ص ۱۰۶۔

(۶) فرسان الھیجاء، ذبیح اللہ محلاتی، ص ۳۶۔

(۷) شہدائے کربلا، گروہ مصنفین، ص ۳۵۸۔

(۸) سورۂ فتح، آیت ۱۷۔

(۹) تنقیح المقال، مامقانی، ج ۱، ص ۱۵۴۔

(۱۰) مقتل الحسین، مقرم، ج ۲ ص ۲۵۳۔

(۱۱) الاستعیاب، ابن عبداللہ، ج ۱، ص ۱۱۲۔

(۱۲) یہ مطلب درج ذیل کتب میں بھی موجود ہے: اسد الغابہ، ابن اثیر، ج ۱، ص ۱۲۲۔ تاریخ الکبیر، بخاری، ج ۲، ص ۳۰۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ابن حجر العسقلانی، ج ۱، ص ۲۷۰۔

(۱۳) فرسان الھیجاء، محلاتی، ص ۳۷۔

(۱۴) تاریخ الکبیر، بخاری، ج ۲، ص ۲۰۔

(۱۵) مثیر الاحزان، ص ۷۱۔

(۱۶) اسد الغابہ، ابن اثیر، ج ۱، ص ۱۲۳۔

(۱۷) انساب الاشراف، بلاذری، ج ۳، ص ۱۷۵ (دار التعارف)

(۱۸) فرسان الھیجاء، ص ۳۷۔

(۱۹) حیاۃ الامام الحسینؑ، ج ۳، ص ۲۳۴۔

(۲۰) الفتوح، ج ۵، ص ۱۹۶۔

(۲۱) الاقبال، ج ۳، ص ۳۴۴۔

(۲۲) منتھی الآمال، ج۱،ص
(۲۳) الاصابہ، ج۱،ص۳۴۹۔
(۲۴) ایضاً،ص۱۱۸۔
(۲۵) فرسان الھیجاء،ص۵۴۔
(۲۶) تنقیح المقال، ج۱،ص۱۹۸۔
(۲۷) وسیلۃ الدارین، زنجانی،ص۱۱۲۔
(۲۸) مقتل الحسینؑ ،ابی مخنف ،ص۱۱۵،۱۱۶۔
(۲۹) زندگانی امام حسینؑ ،رسول محلاتی،ص۲۵۲۔
(۳۰) تنقیح المقال، مامقانی، ج۱،ص۲۳۴ (تین مجلد)
(۳۱) فرسان الھیجاء،ص۷۶۔
(۳۲) تنقیح المقال، ج۲،ص۳۲۷۔
(۳۳) حماسہ حسینی ،استاد شہید مطہریؒ ج۲،ص۳۲۷۔
(۳۴) شہدائے کربلا عبدالحسین بینش، ص۲۸۲۔
(۳۵) تاریخ طبری، ج۵،ص۲۲۶۔
(۳۶) ایضاً
(۳۷) انساب الاشراف، البلاذری، ج۳،ص۱۹۸۔
(۳۸) قاموس الرجال، ج۲،ص۲۴۷۔
(۳۹) الکامل فی التاریخ، ابن اثیر، ج۴،۴۷۔
(۴۰) تنقیح المقال، ج۱،ص۲۳۴۔
(۴۱) شہدائے کربلا عبدالحسین بینش، ص۱۱۵۔
(۴۲) اقبال الاعمال، ج۳،ص۸۷۔
(۴۳) شہدائے کربلا عبدالحسین بینش، ص۱۳۶۔
(۴۴) وسیلۃ الدارین،ص۱۱۴۔

(۴۵) تاریخ اسلام، ابن عساکر، ج۱۱، ص۳۰۳۔

(۴۶) تنقیح المقال، ج۱، ص۲۳۶۔

(۴۷) رجال، شیخ طوسیؒ، ص۷۲، اقبال، ج۳، ص۳۴۶۔

(۴۸) شہدائے کربلا عبدالحسین بینش، ص۱۳۶۔

(۴۹) رجال، شیخ طوسیؒ، ص۳۸، ۶۸۔

(۵۰) الاصابہ، حرف ''حا'' (حبیب بن مظاہر)

(۵۱) سفینۃ البحار، ج۲، ص۲۶۔

۵۲۔ بحارالانوار، مجلسی، ج۴۰، ص۳۱۱۔ (تسبیح یعنی سبحان اللہ، تحمید یعنی الحمداللہ، اور تھلیل یعنی لا الہ الا اللہ کہنا)

(۵۳) تاریخ الطبری، ج۵، ص۳۵۲۔

(۵۴) ایضاً، ج۵، ص۳۵۵۔

(۵۵) ابصارالعین، سماوی، ص۷۸۔

(۵۶) اعیان الشیعہ، ج۲، ص۵۵۴۔

(۵۷) اسرارالشہادہ، ص۳۹۶۔

(۵۸) شہدائے کربلا، ص۱۳۴۔

(۵۹) الفتوح، ج۵، ص۱۵۹۔

(۶۰) اخیارالرجال، الکشی، ص۷۹۔

(۶۱) الدّمعۃ الساکبہ، ج۴، ص۲۷۴۔

(۶۲) شہدای کربلا، ص۱۳۵۔

(۶۳) فرسان الھیجاء ص۱۳۸ از وسیلۃ الدارین، ص۱۳۷۔

(۶۴) اسدالغابہ، ابن اثیر علی بن محمد، ج۲، ص۱۹۲، الاصابہ، ج۱، ص۵۴۲۔

(۶۵) قاموس الرجال، شوشتری، ج۲، ص۴۰۲، ۴۰۶

(۶۶) تنقیح المقال، ج۱، ص۴۳۸۔

(۶۷) شہدای کربلا، ص۱۶۴، از تنقیح، ج۱، ص۴۳۷ تاریخ مدینہ دمشق، ج۲۵، ص۵۰۲۔

(۶۸)اقبال،ص۹۷۔

(۶۹)جمھرۃ انساب العرب،ص۳۹۵۔

(۷۰)ابصار العین،سماوی،ص۱۳۴،عنصر شجاعت، ج۲،ص۹۴۔

(۷۱)فرسان الھیجاء،ص۱۵۴۔

(۷۲)ایضاً

(۷۳)تنقیح المقال، ج۲،ص۱۲۔

(۷۴)شہدای کربلا،ص۱۸۰۔

(۷۵)قاموس الرجال،شوشتری، ج۵،ص۲۷،۲۸۔

(۷۶)وسیلۃ الدارین،ص۵۵نقل از الاصابہ، ج۳،ص۳۰۵۔

(۷۷)فرسان الھیجاء،ص۱۶۷۔

(۷۸)وسیلۃ الدارین،ص۱۵۴۔

(۷۹)شہدائے کربلا،ص۱۹۸۔

(۸۰)اقبال،ص۳۴۶۔

(۸۱)عنصر شجاعت، ج۱،ص۱۳۰۔

(۸۲)یاران پائیدار،ص۹۷۔

(۸۳)تاریخ الطبری، ج۵،ص۳۵۲۔

(۸۴)الفتوح، ج۵،ص۴۸۔

(۸۵)انساب الاشراف، ج۳،ص۱۹۶۔

(۸۶)الاقبال، ج۳،ص۹۷۔

(۸۷)الاصابہ، ج۲،ص۳۲۸۔

(۸۸)ابصار العین فی انصار الحسینؑ،ص۹۲۔

(۸۹)ذخیر الدارین،ص۲۷۰۔

(۹۰)شہدائے کربلا،ص۲۲۸نقل از الاصابہ، ج۷،ص۱۵۱۔

(۹۱)الاصابہ، ج۴،ص۲۷۔

(۹۲)شہدائے کربلا،ص۲۲۹۔

(۹۳)فرسان الھیجاء، ج۲،ص۷۔

(۹۴)تنقیح المقال، ج۲،ص۳۳۲

(۹۵)الاقبال، ج۳،ص۷۸۔

(۹۶)تاریخ یعقوبی، ج۲،ص۶۵۔

(۹۷)الاصابہ، ج۴،ص۴۷نمبر شمار۶۱۱۱۔

(۹۸)تنقیح المقال، ج۲،ص۳۵۵۔

(۹۹)مقتل الحسینؑ ،خوارزمی، ج۲،ص۳۱۔

(۱۰۰)ابصار العین،ص۱۹۹۔

(۱۰۱)تنقیح المقال، ج۲،ص۴۲۔

(۱۰۲)وسیلۃ الدارین،ص۱۸۴۔

(۱۰۳)الاقبال،ص۷۸۔

(۱۰۴)ابصار العین،ص۲۰۱۔

(۱۰۵)فرسان الھیجاء، ج۲،ص۱۱۶۔

(۱۰۶)تنقیح المقال، ج۳،ص۲۱۴۔

(۱۰۷)الکامل فی التاریخ، ج۴،ص۳۔

(۱۰۸)تاریخ الطبری، ج۵،ص۴۲۴۔

(۱۰۹)ایضاً، ج۵،ص۴۱۹۔

(۱۱۰)تنقیح المقال، ج۳،ص۲۷۴۔

(۱۱۱)ایضاً۔

(۱۱۲)مناقب آل ابی طالبؑ ، ج۴،ص۱۲۲۔

(۱۱۳)الاقبال، ج۳،ص۷۷۔

اہل بیت علیہم السلام کی عزاداری

حجت الاسلام محمد اصغر عسکری

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آئمہ اطہارؑ نے حالات زندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے تبلیغی انداز کو ہمیشہ زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھا ہے اوران کا اصول تبلیغ یہی تھا کہ بات کو حالات کے مطابق ہونا چاہئے ورنہ بے اثر ہوجائے گی بلکہ بسا اوقات مضر اور نقصان دہ بھی ثابت ہوگی لہذا انھیں حالات کے تحت تھا کہ کبھی ایک امامؑ نے خطبہ کی زبان اختیار کی اور کبھی دعا کی لیکن واقعۂ کربلا کے بعد تبلیغ کی ایک اور زبان ایجاد ہوگی جس کا نام عزاداری تھا۔

عزاداری درحقیقت آئمہ معصومینؑ کے تبلیغی مشن کے ایک انتہائی محتاط عنصر کا نام تھا جہاں بظاہر اپنے حالات اور گھر والوں پر گذرنے والے مصائب پر گریہ کیا جاتا تھا جس سے عام طور پر شخص کو ہمدردی ہوجاتی ہے اور کوئی شخص اس کی مخالفت نہیں کرتا وہاں اس گریہ وغم کے سائے میں دین کے عظیم پیغام کو نشر کیا جاتا تھا چنانچہ پیغمبر گرامی اسلامؐ سے لے کر امام زمانہ علیہ السلام تک جس قدر حالات نے اجازت دی ہے ہر امامؑ نے تبلیغ دین کے اس عنصر پر زور دیا ہے اور فرش عزا بچھا کر ایک طرف تو لوگوں کو ان عوامل کو تلاش کرنے کا جذبہ دیا کہ جس کے باعث یہ حالات اور مصائب پیش آئے تھے۔ اور اس طرح اس دین تک پہنچنے کا موقع فراہم کیا جس کی تبلیغ کے لئے یہ مصائب برداشت کیے گئے تھے اور دوسری طرف ذکر مصائب کے ذیل میں ان تبلیغات کا بھی انتظام کیا گیا جو آئمہ طاہرین کی زندگی اور ان کے منصب کا نصب العین تھا تبلیغ کی اس زبان اور عزاداری کے عنوان کے تحت آئمہ ھدیٰ علیھم السلام نے تفسیر، حدیث، تاریخ، احکام اور عقائد سب کا تذکرہ فرمایا ہے، حالانکہ عزاداری کا لفظی مفہوم تو صرف غم منانا اور صبر وسکون کا سامان فراہم کرنا ہے جس سے ان مسائل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ذیل میں ہم رسول گرامی اسلامؐ اور دیگر آئمہ ھدیٰ علیھم السلام کی زندگی کا ایک جائزہ اس حوالے سے پیش کرتے ہیں کہ ان مقدس ہستیوں نے عزاداری کا کیسا انداز اپنایا اور اپنے زمانے کے

حالات کے مطابق کیا روش اپنائی ہے؟

خاتم الانبیاءؐ کی عزاداری:

اگر چہ کربلا والوں کی عزاداری کی تاریخ حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے اور تاریخ انسانیت ہی ایک لحاظ سے تاریخ عزاداری ہے اور انبیاء کو وحی کے ذریعے ۶۱ھ کے اس ہونے والے واقعہ کے بارے میں بتایا گیا اور انبیاءؑ نے اپنے اپنے انداز سے عزاداری کی ہے لیکن چونکہ ہمارا موضوع آئمہ واھل بیتؑ کی عزاداری ہے لہذا ہم انبیاء کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور سے آغاز کرتے ہیں۔

پیغمبر گرامی اسلامؐ کہ جن کا قول، فعل اور تقریر تمام مسلمانوں کے لئے حجت ہے اور جن کی ہر بات کی سچائی کی گواہی قرآن نے دی ہے نے اپنے نواسہ کی شہادت سے قبل جب جبرائیل امینؑ نے کربلا کے واقعات کے بارے میں بتایا تو کتنے متاثر اور غمگین ہوئے؟ اس حوالے سے چند احادیث کر بیان کرتے ہیں:

پیغمبر گرامی اسلامؐ ام سلمیٰ کے حجرے میں تشریف فرما تھے ام سلمیٰ سے فرمایا کہ کسی کو میرے پاس نہ آنے دیں ام سلمیٰ روایت کرتی ہیں کہ پیغمبر گرامی اسلامؐ میرے حجرے میں آرام فرما رہے تھے کہ اسی دوران امام حسین علیہ السلام جب آپؑ کا بچپنا تھا وارد ہوئے ام سلمیٰ کہتی ہیں کہ میں حضرت حسینؑ کو نہ روک سکی امام حسینؑ اپنے نانا کے حجرے میں وارد ہوئے اور میں بھی آہستہ آہستہ پیچھے کمرے میں چلی گئی دیکھا کہ امام حسینؑ اپنے نانا کے سینے پر سوار ہیں اور خدا کے رسولؐ گریہ کر رہے ہیں اور آپ کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے رسول اسلامؐ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''اے ام سلمیٰ! مجھے ابھی ابھی جبرائیلؑ نے خبر دی ہے کہ میرا بیٹا حسینؑ قتل کیا جائے گا پھر پیغمبرؐ کے ہاتھ میں جو تربت تھی مجھے دے دی اور فرمایا اسے اپنے پاس محفوظ کرلو اسے دیکھتے رہنا جب یہ تربت خون میں بدل جائے تو سمجھ لینا کہ حسینؑ کو قتل کر دیا گیا ہے۔

ام سلمیٰ نے کہا یا رسول اللہؐ خدا سے دعا کریں کہ خدا حسینؑ کو اس مصیبت سے محفوظ رکھے

رسول اللہؐ نے فرمایا میں نے التجا کی ہے مگر میرے اوپر وحی نازل ہوئی ہے کہ حسینؑ کے لئے خدا کے ہاں ایسا مقام ہے کہ کوئی دوسرا اس تک نہیں پہنچ سکتا اور وہ اپنے شیعوں کی شفاعت کریں گے اور مہدی آل محمدؐ ان کے فرزندوں میں سے ہوگا پس خوش نصیب ہیں وہ لوگ کہ جو حسینؑ سے محبت کرنے والے اور ان کے شیعہ ہوں گے خدا کی قسم ان کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب ہوں گے۔(امالی شیخ صدوق، مجلسی ۲۹، حدیث ۳)

پیغمبر گرامی اسلامؐ نے امام حسین علیہ السلام کی ولادت کے وقت سے ہی عزاداری وگریے کا سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ اسماء روایت کرتی ہیں کہ جب رسول اللہؐ کو حسینؑ کی ولادت کی خبر ملی تو آپؐ جلدی سے حضرت سیدہؑ کے گھر میں گئے جبکہ آپؐ کے چہرہ انور سے غم وحزن کے آثار نمایاں تھے اور حزن آلود آواز میں فرمایا: اے اسماء میرے بیٹے کو لے آؤ بچے کو لایا گیا اور پیغمبر گرامی اسلامؐ کے دست مبارک میں دیا گیا پیغمبرؐ نے بچے کو آغوش میں لیا بوسہ بھی لیتے تھے اور گریہ بھی فرماتے تھے اسماء کہتی ہیں کہ میں پیغمبرؐ کی اس کیفیت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی اور کہا: اے خدا کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں کس لئے گریہ فرما رہے ہیں؟

رسول خداؐ نے فرمایا: اپنے اس بیٹے کے لئے گریہ کر رہا ہوں اسماء بہت حیران ہوئیں اور کہا یہ فرزند تو ابھی متولد ہوا ہے اس کے لئے کیوں گریہ کر رہے ہیں؟ رسول اللہؐ نے فرمایا: تقتلہ الفئۃ الباغیۃ من بعدی لا أنالھم واللہ شفاعتی اس فرزند کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا خدا کی قسم ہرگز میری شفاعت ان کو نہیں ملے گی۔

اسماء کہتی ہیں کہ پھر رسول خداؐ اپنی جگہ سے اٹھے اور غم واندوہ کی حالت میں فرمایا: اسماء اس واقعہ کے بارے میں فاطمہؑ کو نہ بتانا کیونکہ وہ ابھی ابھی اس فرزند کی ماں بنی ہیں۔(حیاۃ الامام الحسین، ج ۱، ص ۲۷)

معجم طبرانی میں اسی سے مشابہ ایک اور روایت نقل کی گئی ہے اور اس کے علاوہ بہت ساری احادیث، پیغمبر گرامی اسلامؐ سے منقول ہوئی ہیں جس میں واقعہ کربلا پر آپ کا گریہ کرنا اور سوگوار ہنا

ثابت ہے اور رسول خدا جہاں حسینؑ کی مظلومیت پر آنسو بہاتے تھے وہاں حسینؑ کی حقانیت کو بھی واضح فرماتے ہیں بعض اوقات جب خدا کے رسول زیب منبر ہوتے تھے اور اپنے صحابہ کو خطبہ ارشاد فرماتے اور اس دوران حسینؑ وارد بزم ہوتے تو رسول خداؐ اپنا منبر چھوڑ دیتے بچے کو آغوش میں لیتے اور پھر لوگوں سے کہتے کہ ھذا حسین فاعرفوہ وانصروہ یہ میرا حسینؑ ہے اس کو پہچان لو اور اس کی مدد کرنا۔

رسول خداؐ نے فرمایا: ﴿أنّ لقتل الحسینؑ حرارۃٌ فی قلوب المومنین لاتبرد أبداً﴾ ''بے شک حسینؑ کی شہادت سے مومنین کے دلوں میں ایسی حرارت پیدا ہوگی کہ جو کبھی بھی ٹھنڈی نہیں ہوگی۔''

یہ فرمان رسولؐ جہاں ایک خبر ہے وہاں یہ اُمر وانشاء بھی ہے یعنی رسول خداؐ یہ چاہتے ہیں کہ مومنین اس عظیم قربانی کو کہ جس نے اپنی قربانی دے کر ہمیشہ کے لئے اسلام کو زندہ کر دیا یاد رکھیں اور لفظ حرارت سے تعبیر فرمانا بھی بے مقصد نہیں ہے بلکہ حکمت ہے کہ حسینؑ کو ایسے یاد رکھو کہ دلوں میں تحرک و بیداری پیدا ہو جائے نہ ایسی یاد کہ جو انسان کو اپنی ذمہ داریوں سے غافل کر دے اور بے کار بنا دے لہذا حقیقی عزادار کی نشانی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں متحرک اور پر جوش دکھائی دیتا ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام:

جیسا کہ رسول خداؐ نے حسینؑ کی شہادت سے قبل آپؑ کی شہادت اور مصیبت عظمیٰ کے حوالے سے بیان فرمایا تھا ایسے ہی حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے بھی بہت ساری روایات بیان فرمائی ہیں بطور نمونہ ہم صرف دو روایتوں کو بیان کرتے ہیں:

1-ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ ہم امیر المؤمنینؑ کے ساتھ صفین کی طرف جا رہے تھے جب فرات کے کنارے نینوا کے مقام پر پہنچے تو حضرت نے بلند آواز سے فرمایا: ابن عباس! کیا اس سرزمین کو پہچانتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں، حضرت نے فرمایا: اگر تو اس سرزمین کو پہچانتا ہوتا تو میری طرح روتے ہوئے گذرتا ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ پھر حضرت کافی دیر تک گریہ کرتے رہے یہاں تک

کہ آپ کے محاسن مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئے پھر فرمایا: اے وائے! میں نے آل سفیان سے کیا کیا ہے؟ شیطان کا گروہ اور شیطان کے دوست اے اباعبداللہ صبر کرو.....پھر فرمایا اے ابن عباس واقعی ایسا ہی ہے جیسا دیکھ رہا ہوں کہ میرے بدن کا ٹکڑا حسینؑ اس سرزمین پر استغاثہ کر رہا ہے اور کوئی اس کے استغاثے کا جواب نہیں دے رہا یہ زمین کربلا ہے کہ جہاں حسینؑ اور میرے اور فاطمہؑ کے سترہ فرزند دفن ہوں گے کربلا کی زمین اُھل آسمان کے نزدیک معروف ومشہور ہے اور وہ کربلا کو ایسے یاد کرتے ہیں جیسے حرمین شریفین اور بیت المقدس کو یاد کیا جاتا ہے۔(امالی شیخ صدوق، ج۵،مجلس ۵۷)

2- ہرثمہ بن ابی مسلم نے بھی اس سے مشابہہ ایک روایت نقل کی ہے: وہ کہتا ہے کہ میں جنگ صفین میں علی علیہ السلام کے ساتھ تھا واپسی پر کربلا پہنچے تو حضرت نے نماز صبح پڑھی پھر کربلا کی کچھ خاک کو اٹھایا ،سونگھا اور فرمایا: اے کربلا کی خاک تو خوش قسمت ہے کہ تجھ سے ایک گروہ اٹھے گا جو بغیر حساب کے بہشت میں داخل ہوگا۔ ہرثمہ کہتا ہے کہ جب میں اپنی مومنہ بیوی کے پاس گیا اور اس واقعہ کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا: اُمیر المؤمنینؑ بغیر حکمت کے کوئی بات نہیں فرماتے۔

جب عبیداللہ ابن زیاد نے اپنے لشکر کو کربلا بھیجا تو یہی ہرثمہ' ابن زیاد کے لشکر میں تھا جیسے ہی یہ کربلا کی زمین پر پہنچا تو اس نے اس زمین کو پہچان لیا اور امیر المؤمنینؑ کی بات اس کو یاد آ گئی گھوڑے پر سوار ہوا اور امام حسینؑ کی طرف چلا آیا اور واقعہ کے بارے میں بتایا امام حسین علیہ السلام نے فرمایا :ابھی تو میری مدد کے لئے آیا ہے یا میرا دشمن ہے؟ اس نے کہا: کوئی بھی نہیں بلکہ کوفہ میں میری ایک بیٹی ہے مجھے ڈر ہے کہ ابن زیاد اس کو قتل نہ کر دے امامؑ نے فرمایا: پس جاؤ اور میری شہادت کو نہ دیکھ اور میرے استغاثہ کو نہ سننا پھر فرمایا: اس خدا کی قسم کہ جس کے ہاتھ میں حسینؑ کی جان ہے جو شخص میری فریاد کو سنے اور میری مدد نہ کرے تو خدا اس کو الٹے منہ جہنم میں ڈالے گا۔(امالی صدوق، ج۶،مجلس ۲۸)

ان دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کربلا کی سرزمین سے جس نبی یا ولی کا گذر ہوا ہے تو اس نے واقعہ کربلا کا ذکر کیا ہے اور ایک خاص عکس العمل ظاہر کیا ہے اور کربلا کی خاک کا ایک خاص انداز سے تکریم واحترام کیا ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؑ کے متعلق کتب میں موجود ہے کہ جب رسول خداؐ نے حضرت سیدہ کوامام حسینؑ کی شہادت کی خبر سنائی تو شدت سے گریہ کیا اور پوچھا: بابا جان! یہ واقعہ کب ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: بیٹی! جب نہ میں ہوں گا نہ تو ہوگی نہ علیؑ اور نہ حسنؑ ہوں گے جناب سیدہ کا گریہ بڑھ گیا اور عرض کی بابا جان! کیا میرے بیٹے کو کوئی رونے والا نہیں ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: بیٹی! خداوند ایک ایسی قوم پیدا کرے گا جن کی خواتین میری ذریت کی خواتین پر روئیں گئیں جن کے مرد میرے اہل بیتؑ کے مردوں پر روئیں گے اور ہر سال اس غم کو تازہ کریں گے قیامت کے دن تو ان عورتوں کی اور میں مردوں کی شفاعت کروں گا۔

ان سارے واقعات میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شہداء کربلا کی عزاداری آئمہ علیھم السلام نے خود بھی کی ہے اور دوسروں کو بھی عزاداری کرنے کی تشویق کی ہے اس لئے کہ یہ گریہ وعزاداری شعار زندگی ہے، گریہ شرافت آدم ہے، تہذیب انسانیت ہے یہ عزاداری ایک طرف تو مظلوم کی مظلومیت پر گریہ ہے تو دوسری طرف ظالم کے خلاف نفرت کا اظہار بھی ہے اس لئے آئمہ علیھم السلام کی تاکید ہے کہ اس ماتم وعزاداری کو زندہ رکھیں کیونکہ اگر عزاداری زندہ ہے تو اسلام زندہ ہے پیغمبر گرامی اسلامؐ سے لے کر امام زمانہ علیہ السلام تک ہر امام نے اور خاندان اہل بیتؑ کے ہر فرد نے عزاداری کی ہے اور صف ماتم بچھائی ہے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو جب زہر دیا گیا تو بیان کیا گیا ہے کہ امام حسینؑ نے گریہ کیا اور بھائی کی مصیبت پر آنسو بہائے امام حسن علیہ السلام نے فرمایا: ﴿**لا یوم کیومک یا اباعبداللہ**﴾ ''اے بھائی حسینؑ! جتنی تیری مصیبت بڑی ہوگی اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت کا دن نہیں ہے۔''

البتہ یہاں مناسب ہے کہ اس مطلب کو بھی واضح کردیں کہ گریہ وعزاداری وسیلہ وذریعہ نہیں بلکہ بذاتہ مطلوب ہے اور بعض حضرات جو اپنے آپ کو روشن فکر گردانتے ہیں یہ تصور کرتے ہیں کہ عاشورا اور کربلا کی یاد منانا صرف روایتی عزاداری (سینہ زنی، گریۂ سیاہ لباس............وغیرہ) میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس مقصد کو اور طریقوں اور دوسرے ذرائع جیسے کانفرنس، سیمنار، محفل و مذاکرے وغیرہ سے بھی

حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعہ عاشورا اور پیغام عاشورا کو سمجھنے کے لئے اسی انداز سے روایتی عزاداری سینہ زنی، گریہ وغیرہ کی ضرورت ہے اگر چہ حضرت سید الشہداء کی شخصیت کے بارے میں کانفرنس، سیمنار اور مقالات علمی و تحقیقی بہت مفید و لازم ہیں مگر روایتی عزاداری کا انداز بھی ضروری اور لازم ہے اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے ایک مقدماتی بحث ضروری ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ انسان کے اندر کون سے عوامل ہیں جو مؤثر ہوں؟ علماء اور ماہرین نفسیات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کے اندر دو اہم عوامل موجود ہیں ایک شناخت و معرفت والا عامل ہے یعنی حس شناخت ہے جو باعث بنتی ہے کہ انسان کسی چیز کو سمجھے اور جانے اور سمجھنے کے بعد پھر اس کو قبول کرے اور دوسرا عامل جو ہر انسان کے اندر پایا جاتا ہے جو کہ شناخت والے عامل سے بھی زیادہ مؤثر ہے وہ انسانی احساسات اور عواطف ہیں آپ اپنی زندگی میں بھی اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ سب سے زیادہ مؤثر عامل یہی احساسات و عواطف والا ہی ہے۔

جو انسان کو کسی ذمہ داری کو انجام دینے پر آمادہ کرتا ہے خواہ وہ انفرادی ذمہ داری ہو یا اجتماعی و سیاسی ہو لہذا ہم جس کام کو انجام دینا چاہیں تو اس کے لئے صرف اس کام کی شناخت و معرفت کافی نہیں ہوتی اور صرف اس کا جان لینا ہمیں حرکت میں نہیں لاسکتا بلکہ احساسات و عواطف ہی ہیں جو انسان کو اس کام کے انجام دینے کا انگیزہ ایجاد کرتے ہیں اور تحرک دلاتے ہیں اور جب تک یہ عامل نہ ہو کام نہیں ہوسکتا صرف یہ جان لینا کہ فلاں کھانا مفید ہے انسان کے لئے کافی نہیں ہے اور اس کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک اس کو بھوک نہ لگے اور اس کھانے کو نہ کھائے ایسے ہی بعض امور کی یہی کیفیت ہوتی ہے کہ صرف ان کا علم کافی نہیں ہوتا جب تک کوئی عمل کا انگیزہ پیدا نہ ہو کہ جو انسان کے اندر تحرک پیدا کرے اب اس مقدماتی بحث کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ تحریک کربلا سے آگاہی اور صرف جان لینا کافی نہیں ہے۔

بلکہ امامؑ کے اس مقدس مشن سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ایک انگیزے کی ضرورت ہے جو ہمیں اس مقدس تحریک کا حصہ بننے پر آمادہ کرے کیونکہ تحریک کربلا ایک مسلسل اور پیہم جدوجہد کا نام

ہے جو ہر دور کے انسان کو آزادی سے جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے اور انسانیت کو یہ درس دیتی ہے کہ ایک مقدس ہدف کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہیے لہذا عزاداری کا رائج انداز سینہ زنی و گریہ وغیرہ کربلا کے واقعہ کی منظر کشی میں زیادہ مؤثر ہے اور کربلا کے پیغام کو اس انداز سے بہتر طور پر منتقل کیا جاسکتا ہے کیونکہ سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ اور سامری کی داستان اس مطلب پر بہترین شاہد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر بلایا گیا تو لوگوں کو بتایا گیا کہ ایک مہینے کے لئے حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر رہیں گے مگر خدا نے دس دن اور بڑھا دیے: ﴿وواعدنا موسیٰ ثلثین لیلة وأتممنها بعشرٍ﴾ جب تیس دن ختم ہوئے تو بنی اسرائیل کی قوم حضرت ہارونؑ کے پاس آئے اور کہا تیرا بھائی کیوں نہیں آیا؟ حضرت ہارونؑ نے کہا منتظر رہیں آجائے گا غرض دس دن گزرے ادھر سے سامری نے فرصت سے استفادہ کیا اور بچھڑا بنا دیا اور کہا: ﴿هٰذا ألٰهكم واله موسیٰ﴾ قوم نے پرستش شروع کر دی خدا نے حضرت موسیٰؑ پر وحی نازل کی کہ آپ کی قوم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی ہے حضرت موسیٰؑ نے سنا اور کوئی عکس العمل نہ دکھایا دس دن اور گذرے تو چالیس دن کے بعد آسمانی الواح کو لوگوں کے پاس لائے تاکہ ان کو شریعت کے احکام اور خدا کی اطاعت کی دعوت دیں حضرت موسیٰؑ نے جب دیکھا قوم بچھڑے کی پرستش کر رہی ہے جیسے ہی حضرت موسیٰؑ نے یہ منظر دیکھا غضبناک ہوئے آسمانی الواح کو کلیم اللہ نے پھینکا: ﴿وألقى الألواح وأخذ برأسِ أخيه يجرّه' اليه﴾

اپنے بھائی کو سر سے اپنی طرف کھینچا اور کہا تم نے قوم کو گمراہ ہونے سے کیوں نہیں روکا؟ اس داستان میں غور کریں اور دیکھیں کہ حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر وحی کے ذریعے خدا نے یہ سب بات بتا دی تھی لیکن اس خبر کو سننے کے بعد حضرت موسیٰؑ نے کوئی عکس العمل نہیں دکھایا اور کوئی غضب کے آثار نہیں تھے لیکن جب خود اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھا ہے غضبناک ہوئے تحمل نہ کر سکے پس معلوم ہوا سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے خدا نے انسان کو ایسے خلق کیا ہے کہ جب وہ کسی چیز کو دیکھے اور کس منظر کا نظارہ کرے تو فوری اثر لیتا ہے کہ جو اثر سننے سے نہیں لیتا۔

ہم واقعہ کربلا کے بارے آگاہی رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ امام حسینؑ اور آپ کے باوفا انصار واصحاب کی کیسے مظلومانہ شہادت ہوئی ہے مگر ہمارا جاننا ہمارے آنسوؤں کو جاری نہیں کرسکتا بلکہ جب مجلس عزا میں شریک ہوتے ہیں مرثیہ خوان مرثیہ پڑھتا ہے خوبصورت اور مؤثر انداز سے خطیب کربلا کی داستان بیان کرتا ہے تو پھر بے اختیار ہمارے آنسو جاری ہوجاتے ہیں لہذا واضح ہوجاتا ہے کہ صرف واقعہ کربلا پر عالمانہ اور محققانہ بحث کرنے ،سیمینار و کانفرنس کے انعقاد سے عزاداری والی افادیت کو حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ لوگوں کے احساسات کوتحریک دینے کے لئے ضروری ہے کہ سیاہ لباس پہنا جائے عزاخانوں کو سیاہ پرچموں سے سجایا جائے اور باقاعدہ مجالس عزا اور عزاداری کے پروگرام منعقد کیے جائیں تاکہ احساسات کوتحرک دیا جاسکے لہذا عزاداری سیاسی وعبادی عمل ہے اورعزاداری سے ان سیاسی مقاصد کوحاصل کیا جائے تب عزاداری کی حقیقی شکل ہوگی۔اہل بیت علیہم السلام نے واقعۂ کربلا کے بعد کس انداز سے عزاداری کی ہے اور کن مقاصد کو اس ذریعے سے حاصل کیا ہے آیئے اس حوالے سے تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں:

عقیلہ ٔ بنی ہاشم ٔحضرت زینب سلام اللہ علیہا:

واقعہ کربلا سے سب سے زیادہ جو ہستی متاثر ہوئی تھیں وہ ثانی زہرا حضرت زینب سلام اللہ علیہا تھیں واقعہ کربلا کے بعد حضرت زینب عالیہؑ اپنے بھائی اور عزیزوں کے سوگ میں مسلسل گریہ کرتیں اور نوحہ کناں تھیں اور کبھی بھی آپ کے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے اور جب اپنے بھائی کی یادگار امام سجادؑ کی طرف متوجہ ہوتیں تو آپ کا غم وحزن بڑھ جاتا تھا اور وہ دلخراش مصائب آپ کے دل کو مزید غم واندوہ میں ڈبو دیتے تھے نقل ہوا ہے کہ حضرت سیدہ اپنے بھائی کی شہادت کے بعد صرف دوسال زندہ رہیں اور اس غم ومصیبت کی وجہ سے آپ کی وفات ہوئی ہے کربلا کے بعد یہ قافلہ سالار بی بی اتنے مصائب دیکھنے کے باوجود جہاں خود عزادار اور گریہ کناں تھیں وہاں دوسروں کو تسلی وتشفی بھی دیتی رہی ہیں جب کربلا کا لٹا ہوا قافلہ مقتل شہداء سے گذرا تو حضرت سجاد علیہ السلام نے جب اپنے مظلوم بابا اور عزیزوں کے بے گور وکفن لاشوں کو دیکھا تو رنگ متغیر ہوگیا اور قریب تھا کہ روح پرواز کرجاتی جب

ثانی زہراؑ نے یہ کیفیت دیکھی تو امام سجادؑ کو متوجہ کیا اور فرمایا: ﴿**مالی أراک ماذا تجود بنفسک یابقیة جدی و أبی و أخوتی**﴾ سجادؑ! میں کیا دیکھ رہی ہوں یہ تو اپنے ساتھ کیا کر رہا ہے؟

کربلا سے کوفہ پھر کوفہ سے شام جہاں موقع ملا اس بی بی نے اپنے مظلوم بھائی کی مجلس پڑھی ہے اور خطبے دیے ہیں ابن زیاد اور یزید ملعون کے بھرے درباروں میں مجلس بپا ہوئی اور بی بی نے بھائی کے پیغام کو عام کیا ہے حضرت زینبؑ اپنے بھائی کی شہادت کے بعد مولیٰ کی نائب خاص تھیں اور حلال وحرام بیان فرماتی تھیں چونکہ امام سجاد علیہ السلام بیماری کی وجہ سے سوال کرنے والوں کا جواب نہیں دے سکتے تھے اس لئے امام جعفر صادق علیہ السلام نے حضرت زینبؑ کے دامن چاک کرنے والے عمل کو جو ثانی زہراؑ نے اپنے باپ اور بھائی کی مصیبت پر کیا ہے اس کے جواز کی سند کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ (جواھر الکلام، ج ۴، ص ۳۰۷)

ارباب مقاتل نے عزاداری اہل بیتؑ کا ایک اور واقعہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب کربلا کا یہ قافلہ کوفہ پہنچا تو حضرت زینب سلام اللہ علیہا کی نظر پڑی کہ نوک نیزہ ہے اور بھائی کا سرِ اُطہر ہے تو ہاتھ تو پابند رسن تھے یہ منظر دیکھنے کے بعد بے ساختہ ام المصائب بی بی نے اپنی پیشانی اونٹ کے کوہان پر ماری پیشانی زخمی ہوئی خون جاری ہوا اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرط غم وحزن میں بے ساختہ اس طرح کا عکس العمل ممکن ہوسکتا ہے۔

کامل میں شیخ بہائی نے نقل کیا ہے کہ حضرت ام کلثومؑ نے کسی کو یزید کے پاس بھیجا تا کہ اجازت دے حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے لئے سوگواری وعزاداری کریں یزید نے اجازت دی اور حکم دیا کہ اہل بیتؑ کو دار الآمارہ میں لے جایا جائے تا کہ وہاں عزاداری کریں اہل بیتؑ نے وہاں سات دن تک عزاداری کی اور شام کی بہت ساری عورتیں ساتھ شامل ہوجاتی تھی اور عزاداری کرتی تھیں مروان نے یزید کو اس عزاداری کی خبر دی اور کہا کہ شام کے لوگوں کی سوچ بدل چکی ہے اور اہل بیتؑ کا شام میں رہنا بادشاہ کی حکومت کے لئے خطرناک ہے لہذا ان کے سفر کے مقدمات کو آمادہ کیا جائے اور ان کو مدینہ بھیج دیا جائے جس کے بعد یزید نے حکم دیا کہ ان کو مدینہ بھیجا جائے معلوم ہوتا

ہے کہ جہاں بھی اہل بیتؑ کو موقع ملا ہے صف ماتم بچھائی ہے اور عزاداری کی ہے اور حضرت سید الشہد اء اور آپ کے باوفا اصحاب کی مظلومیت کی داستان سنائی ہے اور حکومت وقت کے ظلم سے نقاب الٹی ہے اس واقعہ اور دیگر واقعات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ موسمی عزاداری نہیں ہونی چاہیے بلکہ آئمہ ھدیٰ علیھم السلام نے جب موقع ملا عزاداری کی ہے لہذا موسمی عزادار حقیقی عزادار نہیں ہے اور نہ اہل بیتؑ کی مطلوب عزاداری ایسی عزاداری ہے لہذا عزاداری صرف عشرہ محرم سے خاص نہیں ہے بلکہ اہل بیتؑ کی عزاداری ہر وقت اور ہر زمانے میں رہی ہے اور اہل بیتؑ کا پیغام بھی یہی ہے کہ یہ عزاداری ہر وقت رہنی چاہئے کیونکہ دین ابدی ہے موسمی نہیں ہے اور عزاداری دین کے پیغام کا بہترین ذریعہ ہے لہذا عزاداری بھی موسمی نہیں ہونی چاہئے شام میں اہل بیت علیھم السلام کا سات روز تک عزاداری کرنے سے شام کے لوگوں کی سوچ بدل گئی اور یزید کو اپنی حکومت کا خطرہ دکھائی دینے لگا تو معلوم ہوا ایسی عزاداری آئمہؑ نے کی ہے کہ جس سے حکومتیں ہل گئیں اور ظالم گھبرا گئے اور ڈر گئے نہ وہ عزاداری کہ جو ظالموں کو تحفظ فراہم کرے اور حکام وقت عزاداری کی آڑ میں اپنے دنیاوی مفادات کو حاصل کریں ایسی عزاداری نہ آئمہ نے کی ہے اور نہ ان کا مطلوب ہے۔

اہل حرم کا یہ لٹا ہوا قافلہ جب شام سے مدینہ لے جایا گیا تو بشیر بن جذلم کہتا ہے کہ جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا: اونٹوں سے سامان اتار دیا جائے اور قافلے کو روک دیا جائے خیمے لگا دیے گئے اور اہل حرم خیام میں قیام پذیر ہو گئے بشیر روایت کرتا ہے کہ امامؑ نے مجھے بلایا اور فرمایا بشیر خدا تیرے باپ جذلم پر رحمت کرے اچھا شاعر تھا کیا تو بھی شعر کہہ سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں فرزند رسولؐ امام علیہ السلام نے فرمایا: ابھی مدینہ شہر میں جاؤ اور حضرت ابی عبداللہ کی شہادت اور ہمارے مدینہ میں ورود کی خبر مدینہ والوں کو دے دو بشیر کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور جلدی سے مدینہ شہر میں گیا مسجد نبویؐ کی طرف گیا تو وہاں بلند آواز سے یہ اشعار پڑھے:

يا أهل يثرب لامقام لكم بها	قتل الحسين و أدمعي مدرارُ
الجسم منه بكربلا مضرّج	و الرأس منه علىٰ القناة يدارُ

پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: ''علی ابن الحسین علیہ السلام اپنی پھوپھیوں اور بہنوں کے ساتھ مدینہ سے باہر موجود ہیں مورخین نے لکھا ہے کہ جب یہ خبر مدینہ والوں نے سنی مدینہ میں کوئی عورت بھی گھر میں نہ رہی بلکہ سب لوگ گریہ کرتے ہوئے مدینہ سے باہر آئے بشیر کہتا ہے کہ اس دن جو گریہ کا منظر تھا وہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

اب آیئے اس میں غور وفکر کرتے ہیں کہ کیا ضرورت پیش آئی کہ امام سجاد علیہ السلام نے اس مصیبت بھرے قافلے کو مدینہ سے باہر روک لیا سوائے یہ کہ مولیٰ چاہتے تھے کہ مدینہ والوں کا اجتماع کریں اور وہاں پر حضرت سید الشھداء علیہ السلام کی مجلس بپا کریں اور حضرت نے وہاں ایک دردناک خطبہ دیا اور عزاداری کی اور پھر حضرت نے بشیر کو جب مدینہ بھیجا تو پوچھا کیا تو شعر کہہ سکتا ہے؟ یعنی امام علیہ السلام چاہتے تھے کہ اہل حرم کے مدینہ میں ورود والی خبر مؤثر اور حماسی انداز سے دی جائے، لوگوں کے احساسات اور عواطف سے مثبت نتائج لیے جائیں اور اپنی مظلومیت کی داستان اور بنی امیہ کی سیاہ کاریاں بتائی جائیں۔

ہجرت کے آٹھویں سال جب پیغمبرؐ کے فرزند ابراہیم کا انتقال ہوا تو قبرستان بقیع میں دفن کر دیا گیا پیغمبر گرامی اسلامؐ نے اپنے اس فرزند کے فراق میں گریہ کیا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے حضرت سے کسی نے کہا یارسول اللہؐ! آپ دوسروں کو تو گریہ سے منع کرتے ہیں اور خود روتے ہیں؟ رسول خداؐ نے فرمایا: ﴿**لیس ھٰذا بکاء غضب انما ھٰذا رحمۃٌ ومن لایرحم لایرحم**﴾ ''یہ غصے اور شکوے والا گریہ نہیں ہے بلکہ رأفت ورحمت والا گریہ ہے اور جو رحم نہ کرے اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔ (بحار، ج ۲۲، ص ۱۵۱۔ عیون الاخبار الرضا، ج ۲، ص ۱۱)

اور رسول خدا کا یہی فرزند جب آغوش رسول میں تھا اور وقت آخر تھا تو رسول خدا نے اس بچے کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿**أنّا بک لمحزون تبکی العین ویدمع القلب ولانقول مایسخط الرب**﴾

(صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۴۸)

جب رسول خداؐ اپنے فرزند کے فراق میں گریہ کرتے رہے تو واقعہ کربلا کے دردناک اور المناک مصائب پر دل کیوں نہ روئے؟ اور انسان کا عاطفہ و احساسات اس ظلم پر کیوں نہ جوش میں آئیں؟ لہذا یہ گریہ اور رونا انبیاء کی سنت ہے انسانیت کی نشانی ہے شرافت آدمیت ہے اس لئے حضرت آدم علیہ السلام اپنے بیٹے ہابیل کی مصیبت میں اتنا متاثر ہوئے کہ چالیس رات تک گریہ کیا۔

صاحب حیاۃ الامام الحسینؑ نے لکھا ہے کہ اہل بیتؑ کے مدینہ میں وارد ہونے کے بعد بنی ہاشم شہداء کربلا کے سوگ میں غمگین ہوئے اور تین سال تک عزاداری اور ماتم کرتے رہے اور رسول خدا کے عمر رسیدہ اصحاب مسور بن مخذمہ، ابو ہریرہ اور دوسرے اصحاب چھپ کر آتے تھے تا کہ بنی ہاشم کی عزاداری میں شریک ہوں اور بنی ہاشم کے ساتھ ہم صدا ہو کر حضرت سید الشہداء کے سوگ میں گریہ کرتے تھے۔ (حیاۃ الامام الحسین، ج ۳، ص ۴۲۸)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے وقت آخر اپنے فرزند امام جعفر صادق علیہ السلام کو جہاں غسل و کفن کے حوالے سے وصیت فرمائی وہاں خصوصیت کے ساتھ یہ وصیت فرمائی ہے کہ میرے مال میں سے آٹھ سو درہم میری عزاداری کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں اور دس سال تک حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں میرا غم منایا جائے اس وصیت پر غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عزاداری اہل بیتؑ پر خرچ کرنا آئمہؑ کی آرزو تھی اور پھر حضرت نے منیٰ کے مقام کا کیوں انتخاب کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ کیونکہ اس تاریخ کو عام طور پر حجاج اس علاقہ میں رہتے ہیں اور پوری دنیا کے گوشے گوشے سے سارا عالم اسلام اکٹھا ہوتا ہے اس لئے اس نکتہ کا انتخاب فرمایا تا کہ اس طرح سے لوگوں کو حکام وقت کے مظالم اور آل محمدؐ کے فضائل و کمالات اور ان کی تعلیمات سے آگاہی ہوتی رہے اس وصیت سے عزاداری کے اہتمام اور اس پر انفاق کے حوالے سے خصوصی تاکید معلوم ہوتی ہے۔

نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ عزاداری کا اہتمام اور اس کو رواج دینا آئمہ علیہم السلام کی مرضی کے عین مطابق ہے اور انھوں نے خود یہ عمل کر کے دکھایا ہے البتہ وہ عزاداری جو آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی حقانیت اور حکام کے ظلم کو بیان کرے اور جس عزاداری کے سائے میں دین کا پیغام ہو نہ کہ وہ

عزاداری جس سے آئمہ اطہارؑ کی توہین ہو جو مقدسات کی توہین کا باعث بنے جس کو دیکھ کر لوگ آئمہؑ سے دور ہوں۔

امام جعفر صادقؑ اور عزاداری:

چھٹے امام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام ہشتم امام علی رضا علیہ السلام کا دور قدرے فرصت اور مہلت کا دور تھا لہذا ان حضرات نے اس تبلیغی عنصر کو کافی فروغ دیا فرش عزا بچھایا لوگوں کو جمع کیا شاعر یا خطیب سے ذکر مصائب کا مطالبہ کیا اور سامعین کو بلند آواز سے گریہ کرنے پر زور دیا تا کہ ذکر مصائب عام ہو اور لوگ اس کی بنیادیں تلاش کرنے کی طرف متوجہ ہوں ان دونوں اماموں نے اپنے دور میں عزاداری کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

عبداللہ بن سنان روایت کرتا ہے کہ عاشور کے دن میں امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں گیا دیکھا حضرتؑ کا رنگ اترا ہوا ہے بہت غم واندوہ کی کیفیت میں تھے آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح جاری تھے میں نے گریہ کا سبب پوچھا فرمایا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اس دن ہمارے جد حسینؑ کو شہید کیا گیا۔(سفینۃ البحار، ج۳،ص۳۰۳)

ایک سوال ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ (ص) کا یوم وفات اور باقی آئمہ اطہارؑ کے ایام شہادت کو اتنا عظیم مصیبت اور غم وحزن والا دن کیوں نہیں قرار دیا گیا اور ان حضرات کے ایام غم پر اتنا غم کیوں نہیں منایا جاتا ہے؟

یہی سوال ایک صحابی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: عبداللہ بن فضیل کہتا ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ عاشور کا دن اتنی مصیبت وغم کا دن قرار پایا لیکن پیغمبر اسلامؐ کا یوم وفات، مولائے کائناتؑ، حضرت سیدہ زہراؑ اور حضرت امام حسنؑ کے ایام شہادت اتنی مصیبت کے دن کیوں نہیں ہوسکتے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ﴿ **أن يوم الحسين اعظم مصيبةً من جميع الأيام .....فكان ذهابُه، كذهاب جميعهم** ﴾ (وسائل الشیعہ، ج۱، ص۳۹۴)

فرمایا: ''عاشور کا دن اس لئے بڑی مصیبت کا دن ہے کیونکہ جب رسول اللہ کی وفات ہوئی تو امیر المؤمنین موجود تھے، باقی پنجتن آل عباؑ موجود تھے مگر جب ہمارے جد حسینؑ کی شہادت ہوئی تو گویا سب کی شہادت واقع ہوئی ہے اور پنجتن کی آخری نشانی حسینؑ تھے۔''

بعض اوقت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے صحابیوں کو مجالس عزاداری قائم کرنے کا حکم بھی دیتے تھے اپنے ایک صحابی فضیل کو فرمایا: کیا مجالس برپا کرتے ہو اور بحث وگفتگو کرتے ہو؟ جب فضیل نے مثبت جواب دیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا: ان مجالس کو میں پسند کرتا ہوں فأحیوا أمرنا رحم اللہ من أحیٰ أمرنا دعا بھی فرمائی ہے کہ خدا رحم کرے اس شخص پر جو ہمارے امر امامت وولایت کو زندہ رکھے۔ (قرب الاسناد، ص ۱۸)

لہذا آئمہ علیہم السلام نے مختلف اوقات میں اپنے صحابہ کو عزاداری کی اہمیت اور اس کو بپا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے اور بعض اوقت کسی قصیدہ خوان اور مرثیہ خواں کو مرثیہ پڑھنے کا حکم دیتے اور گریہ فرماتے امام جعفر صادق علیہ السلام، ابوھارون مکفوف مشہور مرثیہ خواں کو حکم دیتے کہ مرثیہ پڑھو جب وہ مرثیہ پڑھتا تو دیکھا گیا امام علیہ السلام بہت گریہ فرما رہے تھے اور امامؑ کے رونے کے ساتھ پردے کے پیچھے موجود خواتین بھی گریہ کرتیں اور اس طرح سے یہ صف ماتم بچھائی جاتی رہی۔

امام رضا علیہ السلام اور معروف شاعر دعبل خزاعی:

دعبل بن علی خزاعی جو کہ درجہ اول کا شاعر تھا اور جس کا مقام فصاحت وبلاغت اور شعر وادب بیان سے بالاتر ہے کہتا ہے کہ جب میں نے قصیدہ ''مدارس آیات''، نظم کیا تو چاہا کہ امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں خراسان جاؤں اور یہ قصیدہ ان کے حضور پیش کروں مرو میں امامؑ قیام پذیر تھے اور آپؑ کی ولی عہدی کا دور تھا شیخ صدوق نے روایت کی ہے کہ دعبل مقام مرو میں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا فرزند رسولؐ میں نے آپ کے لئے ایک قصیدہ لکھا ہے اور قسم کھائی ہے کہ آپ سے پہلے کسی کے سامنے نہیں پڑھوں گا امامؑ نے فرمایا: لے آؤ، فرش عزا بچھوا دیا پس پردہ خواتین کو طلب کیا اور پھر اس عظیم مداح اہل بیتؑ نے قصیدہ پڑھا جب یہ شعر پڑھا:

أریٰ فیئھم مقتسماً فی غیرھم　　وأیدیھم من فیئھم صفران

''میں دیکھتا ہوں ان کا مال (فئی) غیروں میں تقسیم ہورہا ہے اوران کے ہاتھ اپنے مال (فئی) سے خالی ہیں۔'' دعبل کہتا ہے حضرت گریہ کرنے لگے اور فرمایا اے خزاعی! تو سچ کہتا ہے پھر دعبل نے ایک اور شعر پڑھا کہ ''جب ان پر ظلم ہوتا ہے تو وہ ظلم کرنے والوں کی طرف اپنی ہتھیلیاں بڑھاتے ہیں جو کہ بدلہ لینے سے بند ہیں۔'' دعبل کہتا ہے کہ امامؑ نے اپنی ہتھیلی کو بند کیا اور فرمایا خدا کی قسم بند ہیں غرض امام علیہ السلام نے دعبل کے ہر شعر پر داد دی اور حوصلہ افزائی کی ہے جب دعبل نے آخری شعر پڑھا جو کہ آپ کے والد گرامی حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارے میں تھا تو امامؑ نے فرمایا: دعبل! میں تیرے اس قصیدے کے ساتھ دو بیت اور ملحق کردوں تا کہ تیرا قصیدہ مکمل ہوجائے پھر امامؑ نے یہ شعر پڑھے:

وقبر بطوسٍ یالھا من مصیبةٍ　　الحش علیٰ الأحشاء باالزفرات

الیٰ الحشر حتیٰ یبعث اللہ قائماً　　یفرّج عنا الھم والکربات

''اور ایک قبر طوس میں ہے اور کتنی بڑی مصیبت ہے اس کی کہ جس نے اپنی گرم سانسوں سے انتڑیوں کو چھیل دیا حشر کے دن تک کے لئے یہاں تک کہ خدا قائم علیہ السلام کو مبعوث کرے گا جو ہمارے غم اور مصیبتوں کو دور کرے گا۔''

دعبل نے پوچھا: مولیٰؑ! یہ کس کی قبر ہے؟ آپؑ نے فرمایا: یہ میری قبر ہوگی تو معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ ھدیٰ علیھم السلام ایسے مداحوں اور شعراء کا کلام سنتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے حقیقت میں مقصد اس ذکر کو زندہ رکھنا تھا۔

دعبل کے اس قصیدے کے بعد امام علیہ السلام نے دعبل کو ایک سو اشرفی کا انعام عطا فرمایا جس پر حضرت کا اسم گرامی کندہ تھا کہ خدمت اہل بیتؑ کا مطلب مفت کام کرنا نہیں ہے بلکہ خدمت کرنا امت کا کام ہے اور انعام دینا اہل بیتؑ کی اپنی ذمہ داری ہے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام نے روایت کی ہے کہ جب بھی ماہ محرم آتا تھا تو میرے والد

کوخوشی میں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا جاتا بلکہ غم واندوہ میں چلے جاتے تھے یہاں تک کہ عاشور کا دن آتا تھا تو اس دن آپؑ کا گریہ بڑھ جاتا تھا اور فرماتے تھے:

﴿**هو يوم الذى قتل فيه الحسينؑ** ﴾(امالی شیخ صدوق،ص۱۲۸)

اس کے علاوہ خود امام علیہ السلام بھی آغاز محرم کے ساتھ ہی سوگواری کا سلسلہ شروع کر دیتے تھے اور محرم کے آغاز میں اپنے صحابی ابن شبیب کو فرمایا:

﴿**يا بن الشبيب أن كنت باكياً فابک علىٰ جدى الحسينؑ** ﴾

اے ابن شبیب! اگر کسی بات پر رونا آئے تو میرے جد حسینؑ پر گریہ کرنا اس لئے کہ انھیں بھوکا، پیاسا شہید کیا گیا ہے۔

البتہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عزاداری صرف عشرۂ محرم سے خاص ہے نہیں بلکہ جیسے ہم گذشتہ واقعات و روایات سے نتیجہ لے چکے ہیں کہ عزاداری موسمی نہیں ہے اور نہ موسمی عزادار ہونا آئمہ ھدیٰ علیھم السلام کا مطلوب ہے۔

اور اس مطلب پر بہترین دلیل امام زمانہ علیہ السلام کے یہ جملے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: ''**لاَندبنّک َصباحاً و مساءً و لَابكينّکَ بَدَلَ ألدموع دَماً**'' اے حسینؑ! میں صبح و شام آپ کی مصیبت پر روتا ہوں اور آپ پر آنسو کے بدلے خون گریہ کرتا ہوں۔ (بحارالانوار ج۹۸،ص۳۲)

آئمہ علیھم السلام کی طرف سے حضرت سیدالشھداءؑ اور آپ کے باوفا اصحاب کی عزاداری پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے اور دین کی بقاء اور اس کو انحرافات سے بچانے میں کوئی عمل عزاداری سے بڑھ کر نہیں ہے عزاداری اسلامی فرہنگ کو فروغ دینے کا بہترین ذریعہ ہے جیسا کہ حکیم امت امام خمینیؒ نے فرمایا: ''امام حسینؑ نے اسلام کو نجات دی اور خود قربان ہو گئے اور جس عظیم ہستی نے اسلام کے لئے قربانی دی ہے ہمیں اس کے لئے ہر روز گریہ کرنا چاہئے اور اس مکتب کی حفاظت کے لئے ہمیں ہر روز مجلس بپا کرنی چاہئے محرم و صفر ہے جس نے اسلام کو زندہ کیا ہے اور حضرت سیدالشھداء علیہ السلام کی قربانی ہے جس نے ہمارے لئے اسلام کو زندہ کیا ہے۔ آخر میں اہل بیت علیھم السلام کی عزاداری کے

چند نمونے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس سے عزاداری اہل بیتؑ کی روش اور انداز مذید واضح ہو جائے گا۔

حضرت امّ البنین:

حضرت عباس علمدارؑ کی مادر گرامی کو جب اپنے بیٹوں کی شہادت کی خبر ملی تو حضرت دن میں قبرستان بقیع میں چلی جاتی تھیں اور اپنے ان جگر گوشوں کی عزاداری اور نوحہ خوانی کرتیں مدینہ کی عورتیں ان کے گرد جمع ہو جاتیں اور ان کے ساتھ ہم نالہ ہو جاتی تھیں تو اس طرح سے عزاداری کا ایک سلسلہ قبرستان بقیع میں جاری رہتا تھا نقل کیا گیا ہے کہ حضرت کی عزاداری اتنی دردناک تھیں کہ اہل بیتؑ کا سب سے بڑا دشمن مروان بن حکم جب دن کو قبرستان سے گذرتا تھا اور حضرت کے نالہ وفریاد کو سنتا تھا تو بہت متاثر ہوتا۔ (حیاۃ الحسین، ۳، ص ۴۳۰)

حضرت کے اپنے جگر گوشوں کے سوگ میں چند اشعار:

یامن رأی العباس کرَّ	علیٰ جماهیر النقد
ووراءَ هُ من ابناء حیدر	کلّ لیث ذولَبَد
أنبئتُ أَنَّ ابنی أُصیب	برأسهٖ مقطوع ید
وَیلی علیٰ شبلی آمال	برأسهٖ ضرب العمد
لو کان سیفک فی یدیک	لَمَا دمیٰ منک أحد
لاتدعونّی ویک ام البنین	تذکِّرینی بلیوث العرین
کانت بنونٌ لی أدُعیٰ بهم	والیوم اصبحتُ ولامن بنین
أربعةٌ مثل نُسورِ الربیٰ	قدواصلوا الموت بقطعِ الوتین

ترجمہ: ''اے وہ جس نے عباسؑ کو دیکھا ہے کہ مخالف گروہ پر حملہ ور ہوتے تھے اور ان کے پیچھے قوی شیر کی مانند حیدرؑ کے بیٹے ہوتے تھے مجھے خبر دی گئی ہے کہ میرے بیٹے کا سر مجروح اور ہاتھ کٹ گئے وای کہ میرے بیٹے کے سر پر عمود کا وار کیا گیا اگر تیرے ہاتھ میں تیری تلوار ہوتی تو کوئی بھی تیرے

نزدیک نہ آ تا اب مجھے ام البنین نہ کہو کیونکہ مجھے میرے بیٹے کے شیر بیٹوں کی یاددلاتے ہو میرے بیٹے تھے کہ مجھے ان کے ذریعے پکارا جاتا تھا اور آج میرا کوئی بیٹا نہیں ہے چار بیٹے تیز پرواز عقاب کی مانند گلے کٹوا کے موت کو جا ملے ہیں۔(نغثۃ المصدر، ص ۲۶۳)

حضرت ام رباب سلام اللہ علیہا:

حضرت ام ربابؑ کہ جن کے والد امرؤ القیس عرب کے بڑے قبیلے سے جن کا شمار ہوتا تھا اور حضرت سید الشہداءؑ کے ہاں حضرت ربابؑ کا بڑا مقام تھا اور ہمیشہ مولیٰ کی نظر ان کے شامل حال تھی روایت کی گئی ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد حضرت ربابؑ جب تک زندہ رہیں ہمیشہ گریہ کرتی رہیں ابن اثیر کہتا ہے کہ حضرت ربابؑ جب قافلے کے ساتھ مدینے واپس آئیں تو قریش کے بزرگوں نے حضرت ربابؑ سے شادی کی خواہش کی تو آپ نے جواب دیا کہ فرزند رسولؐ کے بعد میں کسی اور کے فرزند کی ہمسری میں نہیں آؤں گی ایک سال تک حضرت ربابؑ گریہ وعزاداری کرتی رہیں اور ایک سال تک سائے میں نہیں بیٹھیں اور اسی غم کی وجہ سے آپ کی وفات ہوجاتی ہے۔(کامل ابن اثیر، ج ۴، ص ۸۸)

حضرت ربابؑ نے مولیٰ امام حسینؑ کے لئے یہ مرثیہ کہا ہے جو آپ کے غم واندوہ کی کیفیت کو بیان کرتا ہے:

أنّ الّذی کان نوراً یُستضاءُ بهِ — بکربلا قتیل غیرمدفون
سبط النبی جزاک الله مصالحةً عنّا — وجنبّت خسران الموازین
قدْ کنتَ لی جبلاً صفراً ألوذُبهِ — وکنت تصحبنا باالرحم والدین
من للیتامیٰ ومن للسائلین ومن — یعنی ویاوی ألیه کلّ مسکین
والله لاابتغی صهراً بصهرکم — حتیٰ اغیّب بین الرمل والطین

حضرت امام سجاد علیہ السلام:

مدینہ سے مکہ، مکہ سے کربلا، کربلا سے کوفہ وشام تک کے تمام حالات ومصائب کے عینی شاہد

امام سجاد علیہ السلام تھے اس لئے بابا کی شہادت کے بعد چالیس سال برابر بابا کے غم میں روئے جبکہ دن میں روزہ رکھتے تھے اور رات کو خدا کی عبادت میں بسر کرتے تھے اور جب آپ کا خادم افطار کا سامان آپؑ کے پاس لاتا تو آپؑ شدت سے گریہ کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ میں کیسے پانی پیؤں جبکہ میرے بابا کو پیاسا شہید کیا گیا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرتؑ کی خدمت میں عرض کیا مولیٰؑ ! کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ آپ کم گریہ فرمائیں؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: وای ہو تم پر حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے ایک بیٹا گم ہوا تھا اس کے فراق میں اتنا روئے کہ سر کے بال سفید ہو گئے، کمر جھک گئی اور آنکھوں کی بینائی جاتی رہی درحالیکہ میں نے اپنے اٹھارہ یوسفوں کو زمین پر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا دیکھا ہے جبکہ ان کے بدن پر سر موجود نہیں تھے۔

؎ یک پسر گم کرد یعقوب از فراقش گور شد چون نگریم من کہ یک عالم پدر گم کردہ ام

گذشتہ واقعات و روایات کی روشنی میں ہم حتمی طور پر یہ نتیجہ لے سکتے ہیں اہل بیت علیہم السلام کا انداز عزاداری اور تاکید یہی تھی کہ عزاداری اور جلوس و مجالس کے اس سلسلے کو باقی رکھنا چاہئے اور روڈوں پر جلوس عزا حقیقت میں کربلا کے ابدی پیغام کو زندہ کرنا ہے اور یہ شعائر اسلامی اہل بیتؑ کی حقانیت اور ان کے مقدس ہدف کو بیان کرتے ہیں اور عزاداری ایک سیاسی عبادی عمل ہے لہذا اگر عزاداری سے اسلام کے سیاسی مقاصد کو حاصل نہ کیا جائے تو پھر یہ حقیقی عزاداری کی شکل نہیں ہوگی۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ امالی شیخ صدوق، مجلسی ۲۹، حدیث ۳۔

۲۔ حیاۃ الامام الحسین، ج ۱، ص ۲۷۔

۳۔ امالی شیخ صدوق، ج ۵، مجلس ۵۷۔

۴۔ امالی صدوق، ج ۲، مجلس ۲۸۔

۵۔ جواہر الکلام، ج ۴، ص ۳۰۷۔

۶۔ صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۴۸۔

۷۔ حیاۃ الامام الحسین، ج ۳، ص ۴۲۸۔

۸۔ سفینۃ البحار، ج ۳، ص ۳۰۳۔

۹۔ وسائل الشیعہ، ج ۱، ص ۳۹۴۔

۱۰۔ قرب الاسناد، ص ۱۸۔

۱۱۔ امالی شیخ صدوق، ص ۱۲۸۔

۱۲۔ بحار الانوار ج ۹۸، ص ۳۲

۱۳۔ حیاۃ الحسین، ۳ ص ۴۳۰

۱۴۔ نفثۃ المصدر، ص ۶۶۳۔

۱۵۔ کامل ابن اثیر، ج ۴، ص ۸۸

امام حسین علیہ السلام اور تقیہ

سید رمیز الحسن موسوی

سوال علم کی کلید ہے، انسان کی خلقت کے آغاز سے ہی سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اگر سوال نہ ہوتا تو علم بھی نہ ہوتا سوال ہی کے ذریعے علم و آگہی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور علم کے بند دروازے کھلتے ہیں اور انسان اپنے سوالات اور تجسس کے ذریعے علم کی منزلیں طے کرتا ہے۔ کسی واقعہ اور تاریخی حادثے کے بارے میں سوالات ہر متجسس ذہن میں ہوتے ہیں اور وہ تاریخ کے اس اہم ترین واقعے کی تمام جزئیات تک پہنچ کر اس واقعے کی حق و باطل قوتوں کی پہچان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت کا اہم ترین واقعہ، قیام کربلا ہے کہ جس میں سلسلہ نبوت و رسالت کے آخری تاجدار جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے اور آدمؑ سے لیکر خاتمؐ کی نبوت کے امین، نظام امامت وولایت کے تیسرے تاجدار نے حق و باطل کے اس معرکے میں شریعت کی پاسداری کے لئے اور دین اسلام کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی دی اور تمام مسلمانوں اور حق کے پیروکاروں کے لئے ظلم وستم کے خلاف قیام کرنے کا راستہ ہموار کر دیا اور مظلوموں کو جرائت عطا کی کہ وہ ظالموں کے ظلم واستبداد کے سامنے کبھی بھی سر نہ جھکائیں۔

قیام امام حسینؑ درحقیقت پاسداری شریعت کا نام ہے اور شرعی اصولوں کی حکمرانی اور غیر شرعی زندگی کے خاتمے کا اعلان ہے اس لئے میدان کربلا میں امام عالی مقام کا ہر قدم اور ہر عمل شریعت اسلامیہ کے احیاء کے لئے اُٹھ رہا ہے تھا اور انسانی عقل ومنطق کے عین مطابق تھا۔ اس لئے امامت و ولایت کی معرفت رکھنے والا کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا کہ امام حسین علیہ السلام نے کوئی قدم شریعت کے خلاف اٹھایا ہے اور اپنے جذبات واحساسات سے متاثر ہو کر یزید کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ یہ بات وہی ذہن سوچ سکتا ہے جو امام عالی مقامؑ کی عصمت اور ولایت کا قائل نہیں اور امام علیہ السلام کو ایک عام لیڈر یا عرب سردار کے طور پر پہنچانتا ہے اور یزید و امام حسینؑ کے معرکے کو دو شہزادوں کی جنگ

سمجھتا ہے۔لیکن امام حسینؑ کے دین اسلام میں مقام ومنزلت اور رسول اکرمؐ کی جانب سے امام علیہ السلام کی جو معرفت کرائی گئی ہے اس سے آشنا انسان کبھی بھی اس طرح کی سوچ نہیں رکھ سکتا۔لیکن سوال وشبہہ خواہ معاند کی جانب سے ہو یا دوست کی جانب سے ہو اگر وہ حل ہو جائے اور علم کے دروازے کھول دے تو علم کی کلید ہے۔اس لئے یہاں قیام امام عالی مقامؑ کے بارے میں ایک اہم سوال پیش کیا جاتا ہے اور تاریخ اور عقل وشریعت کی روشنی میں اُس کا جواب تلاش کیا جاتا ہے تا کہ معرفت امامؑ میں اضافہ ہو سکے اور قیام امامؑ کے مقاصد سے آگاہی حاصل کی جا سکے۔

وہ سوال یہ ہے کہ اگر ہم تمام انبیاء اور اولیاء اور معصومین علیہم السلام کی جہد مسلسل پر مشتمل زندگی کو دیکھیں تو ہم ایک چیز بہت واضح نظر آتی ہے اور وہ ہے خطرات کے مقابلے میں تقیہ کی حکمت عملی کہ جو شریعت میں حکم ثانوی کے طور پر جائز قرار دی گئی ہے۔انبیاء اور ائمہ اطہارؑ کی سیرت اور تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ ان ذوات مقدسہ نے ضرورت کے وقت اس حکمت عملی سے استفادہ کیا ہے اور اپنے پیروکاروں کو بھی تقیہ کا حکم دیا ہے۔اگر تقیہ ایک شرعی رخصت ہے اور اس کا جواز روایات میں موجود ہے تو سیدالشہدا علیہ السلام نے تقیہ کا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا؟ اور اس شرعی رخصت سے استفادہ کرتے ہوئے عالم اسلام کو کربلا جیسے افسوس ناک واقعہ سے کیوں نہیں بچایا؟ کیا امام حسین تقیہ نہیں کر سکتے تھے یا وہ تقیہ کے قائل نہیں تھے؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جو دینی معرفت سے عاری اذہان میں پیدا ہو سکتے ہیں۔اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے پہلے خود شریعت میں تقیہ کے مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے لہذا تمہید کے طور پر تقیہ کے بارے میں چند ضروری باتیں یہاں پیش کی جاتی ہیں اور پھر ان کی روشنی میں معرکہ کربلا میں امام حسینؑ کے تقیہ نہ کرنے کی وجوہات پیش کی جائیں گی۔

تقیہ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

سب سے پہلے تقیہ کا لغوی اور اصطلاحی معنٰی بیان کیا جاتا ہے۔لغت میں تقیہ مادہ ''وَقـــیٰ ،یَقِي ''اور''اِتَّـقی، یَتّقِي'' سے مصدر ہے۔[1] بعض نے اسے اسمِ مصدر کہا ہے۔[2] یہاں ''واؤ''،''تاء'' میں بدل گیا ہے۔اس مادہ کے تحت جو بھی کلمات آئے ہیں انکا معنی ،حفاظت کرنا، بچانا، پرہیز کرنا اور

امور کی اصلاح کرنا ہے۔قرآن کریم میں بھی ''وقیٰ'' حفاظت اور بچانے کے معنی میں آیا ہے:''فَوَقٰاهُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِ مَامَكَرُوا'' ۳یعنی: خداوند متعال نے اس (موسیٰؑ) کو ان برائیوں سے بچایا (کہ جو آل فرعون نے اس کے بارے میں سوچ رکھی تھیں)۔

تُقاۃ،تقیّۃ،تقویٰ و اتّقاء، سب ایک ہی (مادہ سے) ہیں۔اسی لئے بعض قرآنی قرائتوں کے مطابق آیہ مبارکہ:''اِلّاأن تَتَّقُوامِنهُم تُقٰاةً'' ۴میں ''تُقٰاةً'' کی جگہ ''تقیّۃ'' پڑھا گیا ہے۔۵

تقیہ کا اصطلاحی معنی بیان کرنے کیلئے بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ان میں سے اکثر تعاریف ''جامع افراد اور مانع اغیار'' نہیں، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی تقیہ کی حقیقی تعریف نہیں بلکہ ''شرح الاسمی'' تعریف ہے۔لہذا ان پر جامع و مانع تعریف نہ ہونے کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں بطور نمونہ بعض علماء سے منقول تقیہ کی چند تعریفیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔شیخ مفیدؒ تقیہ کا اصطلاحی معنیٰ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ﴿التقيّة كتمان الحق و ستر الاعتقاد فيه ومكاتمة المخالفين وترك مظاهرتهم بما يعقب ضرراً في الدّين أو الدّنيا﴾ ۶یعنی:''حق کو پوشیدہ رکھنا اور عقیدہ حقہ کو مخالفین سے چھپانا اور جن چیزوں کے اظہار سے دینی و دنیوی نقصان کا اندیشہ ہو ان کو ظاہر کرنے سے پرہیز کرنا، تقیہ کہلاتا ہے''۔

۲۔شیخ مرتضیٰ انصاریؒ فرماتے ہیں:﴿والمراد هنا التحفظ عن ضرر الغير بموافقته في قول اوفعل مخالف للحق﴾ یعنی:''یہاں تقیہ سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کے مخالفِ حق، قول و فعل کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے ان کی طرف سے (متوقع) ضرر و نقصان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا''۔۷

۳۔علامہ طبرسیؒ لکھتے ہیں:﴿وَالتَقِيَّةُ أَلإِظهٰارُ بِاللِّسٰانِ خِلاٰفُ مايَنطَوى عَلَيهِ القَلبُ لِلخوفِ عَلىٰ النَفسِ﴾ یعنی:''اپنی جان کے خوف سے جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف زبان سے اظہار کرنے کو تقیہ کہتے ہیں''۔۸

۴۔شیخ طوسیؒ تقیہ کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:﴿التقيّة: الاظهار باللسان خلاف ماينطوى عليه القلب للخوف على النفس اذاكان مابطنه هو الحق﴾ یعنی:''اپنی جان کے

خوف سے جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف اظہار کرنے کا نام تقیہ ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ جو دل میں ہو، وہ حق بات ہو (نہ کہ خلافِ حق)''۔[۹]

۵۔آیت اللہ بروجردیؒ لکھتے ہیں: ﴿بِحِفظِ الشّخصِ عقیدَتَهُ مِن جِهة حِفظِ الأمرِ الأَهَمّ﴾ یعنی: ''کسی شخص کا اپنے عقیدے (اور نظریے) کو کسی اہم و نہایت ضروری امر کی خاطر چھپانا (محفوظ رکھنا) تقیہ کہلاتا ہے''۔[۱۰]

یہاں ہم نے علماء، فقہاء اور مفسرین میں سے چند برجستہ شخصیات کے اقوال نقل کیئے ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے الفاظ میں تقیہ کی تعریف کی ہے اور اصطلاحی معنی بیان کیا ہے۔ مذکورہ تعریفوں میں سے بعض کا دائرہ وسیع ہے اور بعض کا دائرہ تنگ ہے اور بہت سے ایسے اقوال و افعال کو شامل نہیں جو تقیہ کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ مثلاً جس تعریف میں فقط باطنی معتقدات کے برخلاف زبانی اظہار کو تقیہ کہا گیا ہے وہ ان افعال کو شامل نہیں کہ جو انسان اپنے اعضائے جوارح سے باطنی اعتقاد کے خلاف انجام دیتا ہے جیسے نماز میں تقیہ کہ جو زبان کے علاوہ انسانی اعضاء و جوارح کے ذریعے اظہار عمل کا نتیجہ ہے۔ لہذا اس اعتراض سے بچنے کیلئے ہم اس تعریف کو وسعت دیتے ہوئے کہہ سکتے ہیں: ﴿التقیّة هی الاظهار باللسان او بسائر الاعضاء﴾ کیونکہ تقیہ کے اکثر موارد ایسے اعمال میں پیش آتے ہیں کہ جو انسانی اعضاء و جوارح سے انجام پاتے ہیں۔

ان تعریفوں میں سے بعض نے فقط ''خوف علی النفس'' کی قید لگائی ہے لیکن ضروری نہیں تقیہ فقط جان کے تحفظ ہی کے لئے انجام پائے بلکہ عزت و ناموس، مال و دولت اور دینی و سیاسی اور اجتماعی مصلحتوں کی خاطر بھی تقیہ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بہت سی روایات و احادیث میں مذکورہ مصلحتوں کی خاطر بھی تقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ البتہ اجتماعی و دینی اور سیاسی مصلحتوں کو ''اولویت'' کے عنوان سے اس تعریف میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''جب تقیہ جان و نفس کی خاطر ضروری ہے تو عام مؤمنین کو ضرر و نقصان سے بچنے اور اسلامی معاشرے و حکومت کی مصلحتوں کی خاطر بطریق اولیٰ لازمی ہوگا''۔ اس طرح عزت و ناموس اور مال و دولت کو بھی اس تعریف میں داخل کیا جاسکتا ہے اور یہ کہہ سکتے ہیں

کہ:''قدرومنزلت اورحرمت کے لحاظ سے مؤمن کی عزت وآبرواورمال ودولت اس کے نفس کی مانند ہے۔جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:**قال النبی (ص):﴿حرمة مال المسلم کحرمة دمه﴾** ''مسلمان کے مال کی حرمت،اس کے خون کی حرمت کی مانند ہے''۔[۱۱]البتہ ان تمام اصطلاحی معنوں اورتعریفات کومدنظر رکھتے ہوئے بعض نے ایک جامع تعریف کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ ایک تعریف میں تقیہ کا یہ مفہوم پیش کیا گیا ہے:

''بعض احکام شرع کو دینی مصالح اوردوسرے اسلامی فرقوں اورمذاہب کے ساتھ مدارا کرنے کی خاطر ترک کرنا تقیہ کہلاتا ہے،اس شرط کے ساتھ (کہ اس ترک کرنے میں) کوئی غرض عقلائی موجود ہو یا جان ومال وعزت وناموس کا خوف ہو''۔[۱۲]

چند نکات

تقیہ کے اصطلاحی مفہوم سے متعلق مذکورہ بالا تمام تعریفوں کے مطالعے سے چند نکات سامنے آتے ہیں جن کی طرف توجہ کرنے سے ہمیں تقیہ کا ایک جامع مفہوم مل سکتا ہے۔وہ نکات یہ ہیں:

۱۔عقیدہ حقہ کومخفی اور پوشیدہ رکھنا تقیہ کا ایک اہم رکن ہے۔

۲۔مخالفین حق کے ساتھ موافقت وہم آہنگی کرنا،تقیہ کا ایک دوسرا رکن ہے۔

۳۔حق کا یہ اخفاء اور باطل کا تظاہر یا تو جان ومال اورعزت وآبرو کی حفاظت کیلئے ہے یا دینی واجتماعی وسیاسی مصالح اور عام مؤمنین کو ضرر وزیاں سے محفوظ رکھنے کی خاطر ہے۔پس کسی دینی عقیدے کو ضرر ونقصان کے خوف سے مخفی کرنے کا نام اسی وقت تقیہ ہوگا جب وہ حق پر مبنی ہوگا۔خلاف حق نظریے وعقیدے کو مخفی کرنا تقیہ نہیں کہلاتا۔

۴۔تقیہ کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک سلبی پہلو اوردوسرا ایجابی پہلو۔حق کا کتمان اورحق کو پوشیدہ رکھنا،سلبی پہلو اورمخالفین حق کے ساتھ موافقت وقدم بہ قدم چلنا،تقیہ کا ایجابی پہلو ہے۔ان دونوں پہلوؤں کی علت ایک ہی ہے اوروہ ضرر ونقصان سے بچنا ہے،ضرر خواہ جانی ہو یا مالی،عزت وناموس کا ضرر ہو یا اجتماعی وسیاسی۔

۵۔تقیہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اپنی قوت کو دشمن کے مقابلے کے لئے محفوظ رکھ کر اسے بلا مقصد ضائع ہونے سے بچایا جائے تا کہ دینی واجتماعی اہداف اور مصلحت عامہ کی خاطر اس ذخیرہ شدہ قوت سے بر وقت استفادہ کیا جا سکے۔

۶۔آیت اللہ بروجردیؒ کی تعریف میں کسی اہم وضروری امر کی خاطر اپنے عقیدے ونظریے کے کتمان کو تقیہ کہا گیا ہے۔اس تعریف میں جو چیز مدنظر رکھی گئی وہ تقیہ کا فلسفہ ہے یعنی ایک عمیق جدوجہد کیلئے آمادہ ہونا اور اپنی قوت کو اجتماعی زندگی کے اہم ترین مقاصد کیلئے استعمال کرنا،تقیہ کہلاتا ہے۔پس تقیہ تدبیر اور حکمت عملی ہے جس کے ذریعے انسان کو نظم وانضباط کیساتھ نظریاتی جدوجہد اور مبارزے کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔

۷۔تقیہ ہر اس قوم وجماعت کیلئے ایک ڈھال وسپر ہے جس پر اکثریت کا غلبہ ہو اور وہ اکثریت،اس اقلیت کو اظہار عقیدہ اور اس کے مطابق عمل کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو تو وہ اقلیت عقلی وشرعی رخصت سے استفادہ کرتے ہوئے فطرت انسانی کے عین مطابق اہم ترین مقاصد کی خاطر تقیہ کا سہارا لیتی ہے۔

تقیہ ،حکم اولی یا حکم ثانوی

اصول فقہ میں احکام شرعیہ کو چند قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔منجملہ احکام کو احکام اولیہ اور احکام ثانویہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔یہاں ان احکام کی تفصیلی بحث مقصود نہیں ہے فقط موضوع کی مناسبت سے ان احکام کی طرف ایک اشارہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا ہے کہ آیا تقیہ حکم اولیٰ ہے یا حکم ثانوی؟ جس کے لیے حکم اولیٰ وحکم ثانوی کی اصطلاحی معنی بیان کرنا ضروری ہے۔

حکم اولیٰ اور حکم ثانوی کی گوناں گوں تعریفیں کی گئی ہیں۔یہاں پیچیدہ اصطلاحی تعریفوں سے بچتے ہوئے ہم سادہ الفاظ میں وہ تعریف نقل کرتے ہیں کہ جو فقہا کے درمیان مشہور ہے۔

حکم اولیٰ:ایسا حکم کہ جو افعال وذوات کے عناوین اولیہ کے لحاظ سے ان پر حمل ہوتا ہے۔جیسے صبح کی نماز کا واجب ہونا،شراب کا حرام ہونا وغیرہ۔حکم ثانوی:ایسا حکم کہ جو کسی موضوع پر اضطرار،اکراہ اور دوسرے عارضی عناوین کو مدنظر رکھتے ہوئے حمل ہوتا ہے۔جیسے ماہ رمضان المبارک میں بیمار کے لیے افطار کا جائز ہونا

یا بیمار کے لیے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا جائز ہونا۔[۱۳] یاد رہے کہ اسے حکم ثانوی اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ حکم اولی کے طول میں واقع ہوتا ہے یعنی پہلے حکم اولی ہے اگر اس پر عمل نہ کیا جا سکے تو حکم ثانوی ہے۔

تقیہ اور دوسرے احکام ثانویہ میں ارتباط

گو کہ تقیہ خود حکم ثانوی ہے لیکن تقیہ کا بعض دوسرے احکام ثانویہ کے ساتھ گہرا ربط موجود ہے۔[۱۴] چونکہ بہت سے موارد میں تقیہ کے جواز کا ملاک و معیار اضطرار ہے۔ جیسا کہ روایت میں ہے: **التقية في كل شئٍ يضطر إليه ابن آدم** [۱۵] "تقیہ ہر اس چیز میں ہے کہ جس میں انسان مضطر ہو جائے"۔ اسی طرح بعض مقامات پر تقیہ عسر و حرج کی وجہ سے جائز ہو جاتا ہے۔ بعض موارد میں "اکراہ" کو بھی تقیہ کے جواز کا باعث قرار دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ تقیہ کی قرآنی ادلہ میں سے سورہ نحل کی آیت ۱۰۶ میں تقیہ کی علت اکراہ کو قرار دیا گیا ہے۔

تقیہ کی ایک دوسری تقسیم:

فقہائے امامیہ نے تقیہ کے احکام تکلیفی بیان کرتے ہوئے اسے بھی دوسرے افعال کی مانند احکام خمسہ میں تقسیم کیا ہے چنانچہ شہید اولؒ اور استاد الفقہاء شیخ انصاریؒ نے تقیہ کے احکام خمسہ اس ترتیب سے بیان فرمائے ہیں:

۱۔ تقیہ واجب: جب دفع ضرر بالفعل واجب ہو[۱۶] اور انسان جان لے کہ تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے اسے یا کسی مؤمن کو ضرر پہنچے گا تو تقیہ واجب ہوگا[۱۷]۔ انسان کسی ایسے ماحول میں زندگی گزار رہا ہو کہ جہاں اظہار اسلام کرنے یا اہل بیت اطہارؑ سے اظہار مودت کرنے سے جان کا خطرہ ہو یا کسی حاکم جائر کے سامنے کوئی بات کہنے سے کسی مؤمن کی جان خطرے میں پڑ جائے تو یہاں تقیہ اور کتمان حق واجب ہو جاتا ہے۔

۲۔ تقیہ مستحب: جب تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے طرف مقابل کی جانب سے تدریجاً ضرر پہنچنے کا احتمال ہو تو تقیہ مستحب ہے۔ دوسرے الفاظ میں اپنے آپ کو خطرے سے دور رکھنے کے لیے تقیہ کرنا مستحب ہے۔ مثلاً مخالفین کے ساتھ ان کی اکثریت کے علاقے میں زندگی گزارنے کے باوجود مدارانہ

کرنا، تدریجی طور پر ان میں نفرت پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے جس سے مستقبل میں خطرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہاں تقیہ کرنا مستحب ہوگا یا کسی مستحب امر میں تقیہ کیا جائے جیسے تسبیحات حضرت زھرا (س) کی ترتیب میں تقیہ کرنا یا اذان کی بعض فصول (مثلاً حی علی خیر العمل) میں تقیہ کرنا وغیرہ[۱۸]۔

۳۔تقیہ مکروہ: جہاں تقیہ نہ کرنا اور ضرر برداشت کرنا، تقیہ کرنے سے بہتر ہو۔ مثلاً کسی قوم کے رئیس و سردار کے تقیہ کرنے کی وجہ سے اس کے پیروکاروں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگیں اور وہ گمان کریں کہ حکم واقعی ویسے ہے جیسے اس نے انجام دیا ہے۔ تو یہاں لوگوں کو گمراہی و سرگردانی سے بچانے کے لئے تقیہ نہ کرنا بہتر ہے۔

٤۔تقیہ حرام: جب تقیہ کرنے کی وجہ سے کسی مؤمن کا خون بہے جانے کا اندیشہ ہو تو وہاں تقیہ حرام ہے (۷) البتہ تقیہ حرام کی تفصیل ''مستثنیات تقیہ'' میں پیش کی جائیں گی۔

متقیہ مباح: جب تقیہ کرنے اور نہ کرنے میں کوئی فرق نہ ہو اور انسان دونوں کے انجام دینے میں مخیّر ہو۔ مثلاً پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں جب ''مسیلمۃ کذاب'' نے نبوت کا دعویٰ کیا تو دو مسلمانوں کو اس کے ساتھیوں نے پکڑ لیا اور ان سے کہا کہ وہ مسیلمۃ کذاب کے نبی ہونے کی گواہی دیں۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے نبی ہیں اور مسیلمۃ جھوٹا ہے۔ مسیلمہ نے اسے قتل کر دیا۔ دوسرے مسلمان نے مسیلمہ کے کہنے پر عمل کیا اور اس کے نبی ہونے کی گواہی دے دی۔ مسیلمہ نے اسے آزاد کر دیا۔ جب یہ خبر پیغمبر اسلامؐ تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: ''پہلا شخص کہ جس نے اقرار نہیں کیا اور قتل ہو گیا وہ بہشت کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ دوسرا شخص کہ جس نے اپنے فریضہ پر عمل کیا اور تقیہ اختیار کر کے محفوظ ہو گیا ہے۔ لہذا ہر دو مأجور ہیں''۔ یعنی تقیہ مباح کی صورت میں تقیہ کرنے والا اور نہ کرنے والا ہر دو مأجور و مثاب ہوتے ہیں[۱۹]۔

امام خمینیؒ کے نزدیک تقیہ کی اقسام: تقیہ کو مختلف لحاظ سے چند اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جتنے بھی محققین اور علماء نے تقیہ کے بارے میں کچھ لکھا ہے ان میں سے کسی نے بھی تقیہ کی اقسام اتنی دقت سے بیان نہیں کیں جتنی دقت اور باریک بینی سے امام خمینی علیہ الرحمہ نے بیان کی ہیں۔ امام امتؒ نے تقیہ کو مختلف لحاظ سے تقسیم کیا ہے۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(الف) تقیہ کی ذاتی تقسیم:

تقیہ ذاتی طور پر چند قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔اسے ہم اسباب کے لحاظ سے بھی تقیہ کی تقسیم کہہ سکتے ہیں۔یعنی تقیہ کرنے کا سبب کیا ہے۔

۱۔تقیہ خوفیہ: کسی خوف اور خطرے کے سبب تقیہ کرنا،تقیہ خوفیہ کہلاتا ہے۔اسے ہم تقیہ اکراہیہ بھی کہہ سکتے ہیں یعنی جبر واکراہ کی وجہ سے تقیہ کرنا۔یہاں خوف وخطرہ بھی تین طرح کا ہوسکتا ہے۔

(۱)اپنی جان و مال یا عزت وآبرو کے خطرے وخوف کی وجہ سے تقیہ کرنا۔(۲) دوسرے مؤمنین کوضرر پہنچنے کے خطرے وخوف کے سبب تقیہ کرنا۔(۳) دنیائے اسلام یا اسلامی معاشرے کو(نا قابل تلافی)ضرر ونقصان پہنچنے کے خطرے وخوف کے سبب تقیہ کرنا۔

خوف وخطریاجبر اکراہ کی بناء پرتقیہ کرنے کی طرف آیات وروایات میں بھی واضح اشارہ ملتا ہے۔چنانچہ سورہ آل عمران کی آیت ۲۸"لایَتّخِذِالمُؤمِنون الخ" تقیہ خوفیہ ہی کی طرف ناظر ہے۔اسی طرح سورہ نحل کی آیت ۱۰۶"وَمَن کَفَرَباللہ مِن اِیمانِہِ اِلَّا مَن اُکرِہَ.....الخ" بھی جبر واکراہ کی بناء پرتقیہ کرنے کے جواز پردلالت کررہی ہے۔بعض روایات واحادیث میں بھی جان ومال اورعزت وآبرو کے خوف کی وجہ سے تقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔جیسا کہ امیرالمؤمنین علی علیہ السلام کی ایک حدیث گذشتہ صفحات میں نقل کی گئی ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

''تقیہ مؤمن کے بہترین اعمال میں سے ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کواوراپنے دینی بھائیوں کوظالموں سے بچاتا ہے.....''۔[۲۰] اسی طرح دوسری بہت سی روایات میں بھی تقیہ کا سبب خوف وخطرکوقرار دیا گیا ہے اوراس کی بناء پرتقیہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔چندروایات ادلہ تقیہ کے ذیل میں نقل کی گئی ہیں۔

تقیہ خوفیہ کی تیسری قسم وہ تقیہ ہے کہ جودنیائے اسلام واسلامی معاشرے کونا قابل تلافی نقصان وضررسے بچنے کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ تقیہ فقط جان ومال کی حفاظت اورخطرے سے بچنے ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں سے بھی زیادہ اہم مقصد کے لیے تقیہ کیا جاتا ہے اوروہ اہم

مقصد دین اسلام اور مذہب حقہ کی حفاظت اور اسے دشمنوں کے خطرے سے محفوظ رکھنا ہے۔امام خمینیؒ تقیہ کی اس قسم کو اذاعہ وافشاء کے مقابلے میں بیان کرتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:﴿ومنها:ماتكون واجبة لنفسها،وهي ماتكون مقابلة للإذاعه،فتكون بمعنى التحفظ عن إفشاء المذهب وعن إفشاء سرّاهل البيت .فينظهرمن كثيرمن الروايات أن التقية التي بالغ الأئمة(ع)في شانها،هي هذه التقية فنفس إخفاء الحق في دولة الباطل واجب وتكون المصلحة فيه جهات سياسية دينية ولولاالتقية لصارالمذهب في معرض الزوال والانقراض﴾[۲۱]

''تقیہ کی ایک قسم وہ ہے کہ جو ذاتاً واجب ہے اور یہ وہ تقیہ ہے جو اذاعہ وافشا کے مقابلے میں ہے ۔پس اس کا معنی مذہب حقہ کو افشاء ہونے سے محفوظ رکھنا اور اہل بیتؑ کے اسرار کو آشکار نہ کرنا ہے۔بہت سی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ جس تقیہ کی تاکید فرماتے تھے وہ یہی تقیہ تھا۔بنابرایں باطل حکومت کے دوران حق کو پنہان رکھنا واجب ہے اور اس اخفاء و پوشیدگی حق کی مصلحت اس کا دینی وسیاسی پہلو ہے۔اگر تقیہ نہ ہوتا تو مذہب حقہ زوال وانقراض کے خطرے سے دوچار ہوجاتا''۔

پس جان ومال اور عزت وآبرو کے علاوہ دین اسلام اور مذہب حقہ کی حفاظت جیسے اہم مقصد کی خاطر تقیہ کرنا واجب ہے۔اگر دین اور مذہب خطرے سے دوچار ہوجائے اور ہمارا تقیہ کرنا اسے بچا سکتا ہو تو تقیہ کرنا واجب ہوجاتا ہے جیسا کہ سیرت آئمہ اطہارؑ خصوصاً امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی مقدس زندگی اس کی شاہد ہے کہ آپؑ نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ دین اسلام اور مذہب حقہ کی مصلحت وحفاظت کی خاطر تقیہ میں گزارا۔

تقیہ مداراتیہ:

دین اسلام میں دوسروں کے ساتھ صلح وآشتی اور مدارا کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔تقیہ مداراتیہ یہ ہے کہ وحدت مسلمین کی خاطر مخالف مذہب مسلمان بھائیوں کے ساتھ صلح وآشتی

اور مدارا کرتے ہوئے ایسا کوئی عمل انجام نہ دینا جوان کی دل شکنی اورنفرت کا باعث بنے، بلکہ چھوٹے موٹے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے مسلمانوں کی محبت ومودّت حاصل کرنا چاہیئے۔تقیہ مداراتیہ میں ضرر ونقصان کا خوف نہیں ہوتا بلکہ فقط مسلمانوں کے اتحاداور باہمی اخوت ومحبت کو برقرار کرنا ہی اس قسم کے تقیہ کا مقصد ہے۔تقیہ مداراتیہ کے بارے میں بہت سی احادیث وروایات ملتی ہیں اورآئمہ طاہرینؑ کی طرف سے اس سلسلے میں خصوصی تعلیمات ملتی ہیں؛ چندروایات ذیل میں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔﴿عن عبداللہبن سنان،عن أبی عبداللہعلیه السلام قال:قال رسول اللہصلی اللہعلیه و آله:أمرنی ربی بمداراۃ الناس کماامرنی بأداالفرائض﴾ ۲۲

''عبداللہ بن سنان امام جعفرصادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا:میرے پروردگار نے مجھے جیسے واجبات وفرائض کی انجام دہی کا حکم دیاہے ویسے ہی لوگوں کے ساتھ مدارااورآشتی کرنے کاحکم بھی دیاہے''۔

۲۔ ﴿عن أبی عبداللہعلیه السلام قال:قال رسول اللہصلی اللہعلیه و آله:مداراۃ الناس نصف الإیمان والرفق بهم نصف العیش﴾ ۲۳

'امام جعفرصادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول خدا ؐ نے فرمایا:لوگوں کے ساتھ آشتی ومدارانصف ایمان ہےاوران سے نرمی ومہربانی کرنانصف زندگی ہے''۔

۳۔﴿عن أبی عبداللہعلیه السلام فی رِسٰالَتِهِ إِلیٰ أصحابه قال:وَعَکَیکُم بِمُجٰاملةِ أهل الباطل............﴾ ۲۴

''حضرت جعفرصادق علیہ السلام اپنے اصحاب کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:تمہارے لیے اہل باطل کے ساتھ خوش رفتاری وخوش کلامی کرناضروری ہے''۔

آئمہ معصومین علیہ السلام کی طرف سے مخالف مذہب کے دینی بھائیوں اوردوسرے مسلمانوں کے ساتھ حسن معاشرت اورمدارااوآشتی کی اس قدرتاکیدکافلسفہ درحقیقت قرآن کے اس فرمان کی تعمیل ہے کہ جس

میں خداوند متعال مسلمانوں کو تفرقہ سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ خداوند فرماتا ہے:

﴿وَاعتَصِمُوا بِحَبلِ اللہِ جَمِیعاً وَلاتَفَرَّقُوا وَاذکُرُوا نِعمَتَ اللہِ عَلَیکُم إذ کُنتُم اعداءً فَأَلَّفَ بَینَ قُلُوبِکُم فَأَصبَحتُم بِنِعمَتِهِ إِخوَانًا......﴾ ۲۵

''تم سب لوگ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور متفرق نہ ہو اور یاد کرتے رہو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر ہے جبکہ تم دشمن تھے۔ پس اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تم اس نعمت کے طفیل بھائی بھائی ہو گئے''۔

متقی (تقیہ کنندہ) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام

۱۔عام انسانوں کا تقیہ: معاشرے کے عام لوگوں کا تقیہ کرنا کہ جو کسی مقام و عہدے پر فائز نہیں۔

۲۔معاشرے کے دینی و غیر دینی رہنماؤں کا تقیہ: ان لوگوں کا تقیہ کرنا کہ جو دینی یا دنیوی لحاظ سے لوگوں کے درمیان کسی مقام و حیثیت کے حامل افراد ہیں مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقیہ کرنا (اگر نبیؐ کے لیے تقیہ کرنا جائز ہو) یا آئمہ طاہرین علیہ السلام ،فقہا ، رؤسائے مذہب اور سلاطین و حکام کا تقیہ کرنا۔ ان میں سے ہر ایک کے تقیہ کے بارے میں جداگانہ بحث کی ضرورت ہے۔

(د) متقی منہ (جس سے تقیہ کیا جاتا ھے) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام

۱۔ کفار و مشرکین سے تقیہ کرنا، خواہ وہ حکام و سلاطین ہوں یا رعایا۔ ۲۔ مخالف مذہب حکام و سلاطین سے تقیہ کرنا۔ ۳۔ مخالف مذہب فقہاء وقضات سے تقیہ کرنا۔ ۴۔ مخالف مذہب عوام سے تقیہ کرنا۔ ۵۔ شیعہ عوام اور حکام و سلاطین سے تقیہ کرنا۔ ۲۶

(چ) متقی فیہ (جس چیز میں تقیہ کیا جاتا ھے) کے لحاظ سے تقیہ کی اقسام

۱۔ فعل حرام انجام دینے میں تقیہ کرنا۔ ۲۔ ترک واجب کرنے میں تقیہ کرنا۔ ۳۔ شرط و جزء ترک کرنے میں یا مانع وقاطع انجام دینے میں تقیہ کرنا۔ ۴۔ موضوع خارجی کے مطابق عمل کرنے میں تقیہ

کرنا۔مثلاً جس دن اہل سنت عید مناتے ہیں لیکن شیعہ کے نزدیک (عدم رویت ہلال کی وجہ سے) عید نہ ہو اس دن افطار کرنے میں تقیہ کرنا وغیرہ۔[۲۷]

مستثنیات تقیہ

احکام ثانویہ کے دوسرے قواعد کی مانند قاعدہ تقیہ سے بھی کچھ موارد مستثنیٰ قرار پاتے ہیں۔فقہاء نے ادلہ تقیہ بالخصوص روایات اور قانون اہم ومہم سے استفادہ کرتے ہوئے جن امور کو قاعدہ تقیہ سے مستثنیٰ کیا ہے اور ان میں تقیہ کو حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ دین میں فسادکی صورت میں تقیہ حرام ہے۔

جو کام بھی دین میں فتنہ وفساد کا باعث بنے اور جس سے ارکان اسلام کے متزلزل ہونے اور شعائر الٰہی کے محو ہونے کا خطرہ ہو اس میں تقیہ کرنا حرام ہے۔مثلاً تقیہ کے طور پر کعبہ اور دوسرے مشاھد شریفہ کو اس طرح تباہ وبرباد کرنا کہ ان کا اثر تک باقی نہ رہے یا مذہب کی ایسی تفسیر کرنا کہ جو الحاد کے مطابق ہو تو یہ تقیہ جائز نہیں ہوگا۔دوسرے الفاظ میں ہر اس کام میں تقیہ کرنا حرام ہے کہ جس پر عمل کرنا جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت سے زیادہ اہمیت کا حامل ہو۔یعنی ایسے امور کہ جن کی حفاظت کے لیے جنگ وجہاد اور جاں نثاری کرنا واجب ہے۔البتہ ان موارد کی تشخیص عام آدمی کا کام نہیں بلکہ مجتہد وفقیہ ہی ان کی تشخیص دے سکتا ہے کیونکہ اس کے لیے ادلہ شرعیہ پر تسلط، ذوق شریعت اور تقویٰ وپرہیزگاری ضروری ہے۔

انہی امور میں سے ایک یہ ہے کہ اگر متقی (تقیہ کنندہ) کوئی بڑی، دینی واجتماعی شخصیت ہو اور اس کے تقیہ کرنے سے مذہب کی توہین ہوتی ہو یا دوسروں کی گمراہی کا اندیشہ ہو تو ایسی شخصیت کے لیے تقیہ کرنا جائز نہیں مثلاً وہ تقیہ کے طور پر بعض محرکات کا ارتکاب کرے (شراب پیئے یا زنا کرے) یا بعض واجبات کو ترک کرنے پر مجبور ہو (نماز، روزہ اور حج بجانہ لائے) تو یہاں دلیل رفع یا ادلہ تقیہ سے تمسک کرتے ہوئے تقیہ کا جواز مشکل ہے۔[۲۸] اسی ضمن میں امام خمینیؒ لکھتے ہیں:

ہر وہ چیز کہ جو اصول اسلام یا اصول مذہب میں سے کوئی اصل یا ضروریات دین میں سے

کوئی ضرورت ہواوروہ زوال وتباہی اورتغیر کے خطرے سے دوچارہومثلاً بعض منحرفین اورطاغی افرادارث،طلاق،نمازاورحج جیسے''اصول احکام'' کوتبدیل کرنے کاارادہ رکھتے ہوں چہ جائیکہ اصول دین یااصول مذہب کوتبدیل کرناچاہیے توایسے موقع پرتقیہ جائزنہیں۔۲۹مستثنیات تقیہ کے اس مورد پرقاعدہ اہم ومہم کےعلاوہ کچھ روایات بھی دلالت کرتی ہیں جن میں سے چندایک یہ ہیں:

۱۔﴿عن مسعدةبن صدقه ،عن أبی عبدالله علیه السلام فی حدیث.أن المؤمن إذاأظهرالإیمان ثم ظهر منه مایدل علی نقضه خرج مماوصف وأظهروکان له ناقضاًإلا أن یدعي أنه إنما عمل ذلک تقیة،ومع ذلک ینظرفیه،فإن کان لیس مما یمکن أن تکون التیقة في مثله لم یقبل منه ذلک،لأن للتقیة مواضع من أزالها عن مواضعها لم تستقم له وتفسیرمایتقیٰ مثل أن یکون قوم سوء ظاهرحکمهم وفعلهم علی غیرحکم الحق وفعله،فکل شيء المؤمن بینهم لمکان التقیة ممالایؤدي إلی الفسادفي الدین فإنه جائز﴾ ۳۰

''مسعدۃ بن صدقہ نے امام جعفرصادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ اگراظہارایمان کے بعدکوئی ایسا کام کرے جس سے ایمان کی نفی ہوتی ہوتووہ مومنوں کی صف سے نکل جاتا ہےلیکن اگروہادعا کرے کہ اس نے یہ کام تقیہ کےطور پرکیاہےتو یہ دیکھناہوگا کہ آیااس کام میں تقیہ جائزتھایانہیں؟اگراس کام میں تقیہ جائزنہیں تھاتواس کاعذرقبول نہیں ہوگا کیونکہ تقیہ کی حدود معین ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا قابل عفونہیں اور''مایتقیٰ'' کامطلب یہ ہے کہ وہ شخص ایسی بڑی قوم میں پھنساہوجوظالم بھی ہوں اوراس پرغلبہ بھی رکھتے ہوں تواس صورت میں مؤمن کاہروہ فعل جوتقیہ کی بناءپرہواورجس سے دین میں فتنہ وفساد پیدانہ ہوجائزہوگا''۔

۲۔''عن درست بن اَبی منصور قال:کُنتُ عندأبی الحسن موسیٰ علیه السلام وعنده الکمیت بن زید،فقال للکمیت:أنت الذي تقول:

فالآن صرت إلی أُمیة والأمورلها مصائر

قال :قلت ذاک والله مارجعت عن إیماني،وإني لکم لموالٍ،ولعدوکم

لقالٍ،ولکنی قلته علی التقیة،قال:أمالئن قُلت ذلک إنی التقیة تجوز فی شرب الخمر"۳۱

''درست بن ابی منصور کہتے ہیں: میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا اور کمیت ابن زید (معروف شاعر و مداح اہل بیت) بھی وہاں موجود تھے، امام (ع) نے کمیت (کو سرزنش کرتے ہوئے) فرمایا: کیا (یہ شعر) تم نے کہا ہے؟''اب میں بنی امیہ کے ساتھ ہوں اور ان کے امور کی برگشت میری جانب ہے''۔

کمیت نے عرض کی: ہاں! میں نے ہی کہا ہے لیکن میں اپنے ایمان سے منحرف نہیں ہوں، میں اب بھی آپؑ کا موالی ہوں اور آپؑ کے دشمنوں کا دشمن ہوں، لیکن میں نے یہ شعر ''تقیہ'' کے طور پر کہا ہے۔تب امامؑ نے اس سے فرمایا: اگر تقیہ ایسے ہی ہونے لگے تو پھر شراب بھی تقیہ کے طور پر جائز ہو جائے''۔

ان دونوں روایات سے جو نکتہ اخذ ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ تقیہ کی کچھ حدود معین ہیں جن کی مراعات ضروری ہے ورنہ تقیہ پر عمل اطاعت کے بجائے نافرمانی شمار ہوگا۔اس لیے قاعدہ تقیہ کے مجاری کی پہچان اور تشخیص ضروری ہے ورنہ 'کمیت' جیسے برجستہ شاعر اور محبّ اہل بیتؑ کو بھی ان حدود کی شناخت نہ رکھنے کی وجہ سے امامؑ وقت کی طرف سے سرزنش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔امام کاظم علیہ السلام کی اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے بنی امیہ جیسے ظالموں کی مدح کرنے میں تقیہ جائز نہیں چونکہ ان جیسے لوگوں کی طرفداری کفر کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور گمراہی و جہالت کو فروغ دینے کا موجب بنتی ہے۔پس کفر و ضلال کو تقویت پہنچانے والی ہر بات میں تقیہ حرام ہے خواہ وہ ایک شعر کی حد تک ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔شراب خوری ،موزوں پر مسح اور متعہ حج میں تقیہ کی حرمت

بعض روایات میں شراب خوری ،موزوں پر مسح کرنے اور متعہ حج میں تقیہ حرام قرار دیا گیا ہے ۔چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

(ا)﴿عن زرارة قال:قلت له:فی مسح الخفین تقیة؟فقال:ثلاثة لاأتقی فیهن أحداً:شرب

المسكر ،ومسح الخفين،ومتعة الحج،قال زرارة:ولم يقل الواجب عليكم أن لاتتقوا فيهن أحداً﴾ ۳۲

زرارۃ سے منقول ہے کہ میں نے امام (ع) کی خدمت میں عرض کیا: کیا موزوں پر مسح کرنے میں تقیہ ہے؟ آپؑ نے فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سے کسی میں بھی، میں تقیہ نہیں کرتا۔نشہ آور چیز (یعنی شراب) میں،موزوں پر مسح کرنے میں اور متعہ حج میں۔زرارۃ کہتے ہیں امامؑ نے یہ نہیں فرمایا: کہ تم پر واجب ہے کہ ان میں سے کسی چیز میں تقیہ نہ کرو''۔

(۲) ایک دوسری جگہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:﴿**والتقية في كل شئى إلا في النبيذو المسح على الخفين﴾** ۳۳''نبیذ (شراب) اور موزوں پر مسح کے علاوہ ہر چیز میں تقیہ جائز ہے''۔

ان روایات کے مطالعے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان امور میں تقیہ کی حرمت کا فلسفہ کیا ہے اور یہ چیزیں دوسری چیزوں کے ساتھ تقیہ کرنے میں کیوں مختلف حکم رکھتی ہیں؟ بعض محققین نے اس سوال کے جواب میں کچھ توجیہات پیش کی ہیں ۳۴ جو یہ ہیں:

(۱) روایت میں نفی تقیہ سے مراد وہ امور ہیں کہ جن میں زیادہ مشقت نہیں ہوتی یعنی ایسی مشقت کہ جو جان و مال کے خوف کا سبب نہیں بنے۔

(۲) شاید امامؑ کی مراد یہ ہو کہ میں ان امور میں فتویٰ دینے میں کسی سے تقیہ نہیں کرتا کیونکہ ان امور کی حرمت مخالفین کی مذہب میں بھی واضح و روشن ہے۔

(۳) مذکورہ تینوں امور کے بارے میں اکثر اہل سنت انکار نہیں کرتے کیونکہ وہ متعہ حج، حرمت مسکر اور وضو کے بعد پاؤں دھونے کے لیے جوتے اتارنے کے منکر نہیں ہیں لہذا ان امور میں تقیہ بلاوجہ ہے ۔

(۴) کیونکہ ان موارد میں کسی قسم کے ضرر و نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا لہذا تقیہ ضروری نہیں ہے۔

(۵) ان موارد میں ترک تقیہ کی بہترین دلیل قرآن و سنت ہے کیونکہ متعہ حج کے بارے میں قرآن میں حکم موجود ہے ۳۵ اور موزوں پر مسح نہ کر کے صرف پاؤں پر مسح کرنے کے بارے میں بھی قرآن میں

صراحت موجود ہے۔۳۶ چونکہ پاؤں پر مسح تب ہی ہوگا جب ٹوپی یا موزے اتار کر فقط سر یا پاؤں پر مسح کیا جائے گا۔۳۷

(۶) پہلی روایت میں امامؑ نے "ثلاثة لا اتقی فیهن احداً" فرما کر فقط اپنا شخصی حکم بیان کیا ہے۔ چونکہ روایت کے ذیل میں زرارۃ کا یہ جملہ بھی نقل ہوا ہے کہ "**ولم یقل الواجب علیکم أن لاتتقوا فیهن احداً**"۳۸

لیکن ان تمام توجیہات کے باوجود اگر ضرورت پڑ جائے تو مذکورہ تینوں موارد میں تقیہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر جان خطرے میں ہو تو جان کی حفاظت شراب نہ پینے یا موزوں پر مسح نہ کرنے سے زیادہ اہم ہے لہذا یہاں جان کے خوف کی وجہ سے تقیہ جائز ہو جاتا ہے۔ اس بات کی تائید درج ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے:

﴿**عن أبی الورد قال: قُلتُ لأبی جعفر: "إن أباظبیان حدثنی أنه رأیٰ علیاً أراق الماء، ثم مسح علی الخفین، فقال: کذب أبو ظبیان، أمابلغک قول علی علیه السلام فیکم: سبق الکتاب الخفین؟ فقُلتُ: هل فیهما رخصة؟ فقال: لا، إلا من عدو تقیة، أو ثلج تخاف علیٰ رجلیک**﴾۳۹

"ابی الورد سے منقول ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ابوظبیان نے مجھ سے کہا کہ: میں (ابوظبیان) نے علی علیہ السلام کو دیکھا ہے کہ انھوں نے پانی بہا دیا اور موزوں پر مسح کیا، امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: ابوظبیان نے جھوٹ بولا ہے۔ کیا تم نے علی علیہ السلام کا یہ قول نہیں سنا کہ قرآن میں تمہارے لیے خفین کا حکم بیان ہو چکا ہے؟ میں نے عرض کی کیا اس میں رخصت ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ دشمن سے تقیہ کے طور پر یا پاؤں کو برف سے بچانے کے لیے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے"۔

صاحب جواہر بھی مذکورہ بالا احتمالات ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ﴿**لم نعثر علی عامل بهذا الروایة أو مَن استثنیٰ ذلک من عمومات التقیة**﴾۴۰

''میں نے کسی کو اس روایت پر عمل کرتے نہیں پایا اور نہ اس مورد کو عموماتِ تقیہ سے استثناء کرتے دیکھا ہے۔''

پس خلاصہ یہی ہے کہ مذکورہ تینوں امور میں زیادہ خوف وخطرہ نہیں ہوتا اس لیے ان میں تقیہ کرنا بے جا ہے چونکہ تقیہ خوف وخطرے کی صورت میں جان کی حفاظت کے لیے ہے۔ بالفرض ان امور میں بھی جان وغیرہ کا خطرہ ہو تو تقیہ جائز ہو جائے گا اور یہ (تینوں) موارد تقیہ کے مستثنیات میں سے نکل جائیں گے۔

۳۔قتل میں تقیہ جائز نہیں

یعنی جب بھی انسان کی جان ومال یا عزت وآبرو کسی بے گناہ شخص کے قتل پر موقوف ہو جائے تو یہاں انسان اپنی جان ومال یا عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے تقیہ نہیں کرسکتا اور کسی بے گناہ کو قتل نہیں کرسکتا۔ متعدد روایات اس قسم کے تقیہ کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں منجملہ ایک روایت میں محمد بن مسلم امام باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

﴿اِنَّماجعلت التقية ليحقن بهاالدم،فإذابلغ الدم فليس تقية﴾[۴۱]

''تقیہ (کا حکم) جان کی حفاظت کے لیے وضع کیا گیا ہے جب یہ خود جان لینے کا سبب بن جائے تو یہاں تقیہ جائز نہیں ہے''۔

نص کے علاوہ فتاویٰ میں بھی اس قسم کے تقیہ کو حرام قرار دیا گیا ہے۔[۴۲]

۴۔آئمہ طاہرینؑ سے اظہارِ برائت میں تقیہ

آئمہ طاہرین بالخصوص امیر المومنین علی علیہم السلام سے اظہار برائت کرنے میں تقیہ کے جواز وعدم جواز کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں جن میں سے بعض عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں بعض رخصت پر دلالت کرتی ہیں اور بعض میں وجوبِ برائت پر دلالت ملتی ہے۔ اظہار برائت کے عدم جواز پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے:

﴿عن محمد بن ميمون ،عن جعفر بن محمد،عن ابيه،عن جده قال:قال

اَمیرُ المئو منین (علیه السلام): ستدعون اِلی سبّی فسبّونی ،وتد عون اِلی البرائة مِنی فمدو الرقاب،فاِنی علی الفطرة﴾ ۴۳

''محمد بن میمون سے منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد ماجد سے نقل کیا ہے کہ: امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے فرمایا: عنقریب تم کو مجھے بُرا کہنے کے لیے کہا جائے گا، تم مجھے (العیاذ باللہ) بُرا کہہ دینا (پھر) تمہیں مجھ سے اظہارِ برائت کرنے کو کہا جائے گا، تم اپنی گردن کٹا دینا (مگر مجھ سے اظہارِ برائت نہ کرنا) چونکہ میں فطرت اسلام پر ہوں''۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''سب'' کرنے میں تقیہ جائز ہے لیکن اظہار برائت میں جائز نہیں۔ اسی مضمون کی ایک روایت علی بن الخزاعی نے امام رضا علیہ السلام سے بھی نقل کی ہے۔ ۴۴ اسی طرح بعض دوسرے منابع میں بھی اس قسم کی روایات ملتی ہیں۔ رخصت پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے:

﴿محـمـد بـن مسعود العیاشی فی (تفسیره)عن اَبی بکر الحضرمی ،عن اَبـی عبداللہ(علیه السلام).فی حدیث .اَنه قیل له : مدالرقاب اَحبّ الیک اَمالبرائة مِـن عـلـی(عـلیـه السـلام) ؛فقال:الرخصة اَحبّ اِلّیَ،اَمّاسمعتَ قول اللہِعّزوجل فی عمار:"اِلّاَ مَن اُکرِهَ وَ قَلبُهُ مُطمَئِنّ بِالاِیمَانِ﴾ ۴۵

''محمد بن مسعود عیاشی اپنی تفسیر میں ابوبکر حضرمی کے حوالے سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ امامؑ کی خدمت میں عرض کیا گیا: آپ کو گردن کٹا دینا پسند ہے یا علی علیہ السلام سے اظہارِ برائت کرنا؟ آپ نے فرمایا: مجھے رخصت پسند ہے۔ کیا تم نے عمارؓ کے بارے میں خداوند عزوجل کا یہ قول نہیں سنا: ''مگر وہ شخص جس کو مجبور کیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو''۔

وجوب برائت ۴۶ پر دلالت کرنے والی ایک روایت یہ ہے:

﴿عـن مسعـدة بن صدقه قال :قلتُ لاَبی عبداللہ(علیه السلام):إنَّ النَّاس یَـرَونَ أنَّ عَـلیًّـا(عـلیـه السـلام)قـال عـلی منبرالکوفة:أَیُّهَاالنَّاس اِنَّکُم سِتِدعونَ إلی

سبّيفَسبّونی،ثم تدعون إِلیٰ البراء ةمِنّی فلا تَبرَؤوا منّی،فقال:ماأكثرمايكذب الناس علیٰ علی(عليه السلام)ثم قال:إنّماقال:إنَّكُم سَتَدعونَ إلیٰ سبّيفسبّونی،ثم تَدعونَ إِلیٰ البراءةمِنی وَإنّي لعلیٰ دين محمد (صلی اللّٰه عليه وآله)ولم يقل:وَلاتبرؤوامِنّی،فقال له السائل:أرأيت أن أختار القتل دون البراءة،فقال:واللّٰه ماذلک عليه وماله إلّامامضیٰ عليه عماربن ياسرحيث أكرهه أهل مكّةوقلبه مطمئن بالإيمان،فأنزل اللّٰه عزوجل فيه"إِلَّامَن أُكرِهَ وَقَلبُهُ مُطمَئِنٌّ بِالإِيمَانِ"فقال له النبّی(ص)عندها:ياعمار إن عادوافعد،فقدأنزل اللّٰه عزرک وأمرکَ أن تعدإن عادوا﴾ ۴۷

''مسعد ۃ بن صدقہ سے منقول ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی: لوگ کہتے ہیں کہ: علی علیہ السلام نے منبر کوفہ سے اپنے خطاب میں فرمایا: اے لوگو! عنقریب تم کو مجھ پرسب وشتم کرنے پرمجبور کیا جائے گا تو اس وقت تم مجھ پرسب وشتم کرسکتے ہو۔ پھر تمہیں مجھ سے اظہار برائت کے لیے کہا جائے گا، تم مجھ سے اظہار برائت نہ کرنا......اس پرامام صادق علیہ السلام نے فرمایا: لوگ علی علیہ السلام کے بارے میں کس قدر جھوٹ بولتے ہیں۔ حالانکہ علی علیہ السلام نے یوں فرمایا تھا: ''تمہیں مجھ پرسب وشتم کرنے کے لیے کہا جائے گا تو کردینا۔

پھر اظہار برائت کے لیے کہا جائے گا تو یاد رکھو میں دین محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پرہوں۔ آپؑ نے یہ نہیں فرمایا: ''مجھ سے اظہار برائت نہ کرنا''۔ اس پرسائل نے (امام صادق علیہ السلام سے) عرض کی: کیا آپؑ فرماتے ہیں کہ میں اظہار برائت کے بجائے قتل ہوجاؤں؟ تو آپؑ نے فرمایا: ''حضرت علی علیہ السلام کی مراد یہ نہیں، اس سے مراد عمار بن یاسر کا طریقہ ہے جوانھوں نے کفار مکہ کے مجبور کرنے پر اختیار کیا تھا، جبکہ ان کا دل ایمان سے مطمئن تھا۔

جس پرخداوند متعال یہ آیت نازل فرمائی ''مگر وہ شخص جس کومجبور کیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو''، تو رسول خداؐ نے عمارؓ سے فرمایا: اے عمارؓ! اگر وہ لوگ دوبارہ مجبور کریں تو تم

پھر وہی کرو، خداوند نے تیرے عذر سے مجھے آگاہ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اگر وہ تمہیں پھر مجبور کریں تو وہی طریقہ اختیار کرو'۔

اس حدیث میں امام صادق علیہ السلام نے حضرت عمارؓ کے قصہ سے استشہاد کر کے وجوب تقیہ کی نفی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہاں تقیہ کرنا حرام نہیں بلکہ تقیہ کے طور پر برائت کی جاسکتی ہے۔آئمہ طاہرینؑ سے تقیہ کے طور پر اظہار برائت کے جواز وعدم جواز کے متعلق منقول روایات میں بظاہر تضاد وتناقض نظر آتا ہے اور یہ جاننا مشکل ہوجاتا ہے کہ اظہار برائت کا مسئلہ مستثنیات تقیہ میں سے ہے یا نہیں؟ لیکن اگر ان روایات کو سند ومتن کے لحاظ سے زمان ومکان کے]پتقاضوں اور متقی (تقیہ کنندہ) افراد کی شخصیت واجتماعی حیثیت کے اعتبار سے عقل ودرایت کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ان کا تضاد وتناقض ختم ہوجاتا ہے اور ان روایات میں ایک قسم کا ارتباط ونظم برقرار ہوجاتا ہے۔لہذا اس قسم کی روایات کو دقیق طور پر سمجھنے کے لیے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

آئمہ طاہرینؑ کے فرمودات کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ یہ حضراتؑ زمان ومکان کے تقاضوں اور مخاطبین کے ایمانی درجات فہم وشعور اور صبر واستقامت کو مدنظر رکھ کر کوئی حکم صادر فرماتے تھے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں ایک موضوع کے بارے میں مختلف حکم ملتے ہیں۔اس کا فلسفہ یہی تھا کہ آئمہ اطہارؑ مخاطب کی شخصیت، فہم، شعور اور زمان ومکان کے تقاضوں کے مطابق حکم اولی وحکم ثانوی بیان فرماتے تھے چونکہ امام معصوم سے زیادہ کون حکم اولی وحکم ثانوی کے موقع ومحل کی تشخیص کرسکتا ہے۔

اسی لیے آئمہ اطہارؑ بالخصوص امیر المؤمنین علی علیہم السلام سے اظہار برائت کے بارے میں تقیہ کرنے کے جواز وعدم جواز کا حکم بھی مختلف ملتا ہے چونکہ آئمہ طاہرینؑ کے مخاطبین نہ صرف اپنے زمانے کے لوگ تھے بلکہ اپنے علم لدنی کی وجہ سے وہ آئندہ زمانے کے حالات کو بھی حکم بیان کرتے وقت مدنظر رکھتے تھے۔چونکہ اظہار برائت کو مسئلہ ہر زمانے میں اور ہر قسم کے اشخاص کو پیش آسکتا ہے۔ لہذا روایات میں ان سب چیزوں کو مدنظر رکھ کے حکم دیا گیا ہے چونکہ تقیہ کا فلسفہ نہ فقط

مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اساس دین و مذہب کی حفاظت بھی ہے۔ ہوسکتا ہے ایک وقت اظہار برائت کرنے سے پورے دین و مذہب کی اساس ہی خراب ہوجائے اور ایک وقت اظہار برائت نہ کرنے سے دین پر تو کوئی حرف نہ آئے لیکن کئی قیمتی جانیں بغیر کسی اہم فائدے کے ضائع ہوجائیں اس مسئلہ کو اگر تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس مسئلہ کا فہم آسان ہوجاتا ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ جب بنی امیہ و بنی عباس جیسے دشمنان اسلام اپنے دینوی اقتدار کی خاطر رسول اسلامؐ کے حقیقی جانشینوں یعنی آئمہ طاہرینؑ کے نام ونشان کو صفحہ ھستی سے مٹا دینا چاہتے تھے اور مختلف حیلوں بہانوں سے امت اسلام کو ان ذوات مقدسہ سے دور رکھنے کے لیے اہل بیتؑ سے اظہار برائت پر مجبور کرتے تھے ایسے حالات میں ان ذوات قدسیہ سے اظہار برائت کے سلسلے میں تقیہ کرنا اور آئمہ اہل بیتؑ کے مذہب ومشن سے اظہار برائت کرنا، دشمنوں کے اہداف کی تکمیل کے مترادف تھا۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آئمہ معصومین علیہ السلام کے باوفا اصحاب اور ساتھیوں میں سے کوئی بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس نے آئمہ سے برائت کا اظہار کیا ہو یا اس سلسلے میں تقیہ جیسی رخصت سے استفادہ کیا ہو، سوائے یہ کہ خود آئمہؑ نے اسے اس کام پر مأمور کیا ہو چنانچہ حجر بن عدی، میثم تمار، عمرو ابن الحمق، عبداللہ بن عفیف، سعید بن جبیر رضوان اللہ علیہم نے فقط آئمہ اہل بیتؑ سے اپنا قوی ارتباط برقرار رکھنے کے جرم میں اپنی جانیں قربان کرڈالیں اور کسی بھی مقام پر تقیہ کو سپر بناتے ہوئے آئمہؑ سے اظہار برائت نہیں کیا چونکہ یہ لوگ مکتب اہل بیتؑ کے پرورش یافتہ تھے اور تعلیمات اہل بیتؑ سے مکمل طور پر آگاہ ہونے کی وجہ سے حکم اولی و حکم ثانوی کی بہتر تشخیص دے سکتے تھے لہذا ان مقدس و متشرع افراد کی سیرت ایسے نازک وحساس موقعوں پر ترک تقیہ کے رجحان پر بہترین دلیل ہے اور آئمہ معصومینؑ کی ان روایات کی تائید کرتی ہے کہ جن میں اظہار برائت میں ترک تقیہ کا حکم ملتا ہے۔

اس کے مقابلے میں ایک ایسا زمانہ ہے کہ جس میں آئمہ طاہرین علیہ السلام سے اظہار برائت کرنے یا نہ کرنے سے کسی دینی ومذہبی اساس پرخدشہ وارد ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا یا اظہار برائت پر مجبور ہونے والے افراد بھی کسی قسم کی دینی ومذہبی شخصیت کے حامل نہیں ہیں یعنی عام لوگ ہیں اوران کے کسی قول وفعل سے اساس دین ومذہب کے بگڑنے کا اندیشہ نہیں ہے اس صورت میں ان عام مؤمنین کی جانیں اگر آئمہ معصومینؑ سے ظاہری ارتباط کٹ جانے یا اظہار عقیدہ نہ کرنے کی وجہ سے محفوظ رہ جاتی ہیں تو اس کے لیے تقیہ کرنا یقیناً عقل وشرع کے مطابق ہوگا۔

بالفرض اگر وہ اپنے جذبات واحساسات کے تحت تاثیر آئمہ اطہارؑ سے اظہار عقیدت کرنے کی وجہ سے اپنی اوردوسرے مؤمنین کی جانوں کوخطرے میں ڈالتے ہیں اوران کے اس عمل سے بلاوجہ جانوں کے تلف ہوجانے کے سوااورکوئی عقلی فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو یہاں آیہ مجیدہ ''لاتُلقُوا بِأيدِيكُم إلىٰ التَّهلُكة'' ۴۸؎ کی مخالفت کے سبب ان کا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا خلاف عقل وشرع محسوب ہوگا۔لہٰذا تقیہ کے وجوب وعدم وجوب میں موقع ومحل کی تشخیص اور تقیہ کرنے والے افراد کی موقعیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اسی لیے فقہاء نے تقیہ کو احکام خمسہ (واجب،مستحب،مکروہ،حرام اورمباح) میں تقسیم کیا ہے۔ہمارے اس بیان کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے چنانچہ ایک روایت ہے کہ:

﴿عن محمد بن مروان قال:قال لی أبوعبداللهعليه السلام:مامنع ميثم رحمه اللهمن التقية؟فواللهلقد علم إنَّ هذه الآية فی عمار و أصحابه:''إلَّامَن اُكرِهَ وقَلبُهُ مُطمَئِنٌّ بِالإِيمانِ﴾۴۹؎

''محمد بن مروان سے منقول ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا: میثم پرخدا رحمت کرے اس کو کس چیز نے تقیہ سے روکا ہے؟ خدا کی قسم! وہ جانتا تھا کہ یہ آیت ''إِلَّامن اکرہ وقلبه............الخ'' عمار اوراس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے''۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ امامؑ میثمؓ کی موقعیت اورعمارؓ کی موقعیت میں فرق بتانا چاہتے ہیں یعنی حضرت میثمؓ،حضرت عمارؓ کے بارے میں نازل ہونے والی آیت سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ

اکراہ کی صورت میں تقیہ کا حکم بھی موجود ہے لیکن وہ آئمہ اطہارؑ سے اپنی غیر معمولی وابستگی اور اپنے زمانے کے تقاضوں کا ادراک رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ عمارؓ کے زمانے میں اور میرے زمانے میں فرق ہے عمارؓ کے زمانے میں مؤمنین کی تعداد انتہائی کم تھی ایک مؤمن کا فقدان بھی اسلام کے لیے غیر معمولی نقصان تھا لہذا کفار و مشرکین کے مقابلے میں تقیہ کرنا ہی ان کا فریضہ تھا جبکہ بنی امیہ کے مقابلے میں آئمہ اطہارؑ سے اظہار عقیدت میرے جیسے شخص کا فریضہ ہے۔ پس انھوں نے اپنے بلند مقام و مرتبہ کے ساتھ قتل ہو جانے کو ترجیح دی اور آئمہؑ سے برائت کرنے میں تقیہ نہیں کیا۔ اس روایت سے موارد تقیہ میں فرق بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات ترک تقیہ رجحان رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ تقیہ کے دوسرے موارد کی طرح اظہار برائت کے سلسلے میں بھی تقیہ کرنے یا نہ کرنے میں زمان و مکان اور متقی (تقیہ کنندہ) افراد کی موقعیت کو گہرا دخل حاصل ہے۔ پس یہ مسئلہ فقط بنی امیہ و بنی عباس کے دور سے ہی مختص نہیں بلکہ آج کے زمانے میں بھی اظہار برائت کے سلسلے میں تقیہ کے موارد کی تشخیص ضروری ہے بالخصوص ہمارے ملک میں انقلاب اسلامی کے بعد جو حالات پیدا ہو چکے ہیں اور دشمنان اسلام اہل بیت اطہارؑ سے اظہار عقیدت و مودّت کے جو اثرات دیکھ چکے ہیں جن کے بعد وہ ان ذوات مقدسہ کی عقیدت اور مودّت کو مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

اہل بیتؑ سے اظہار برائت کروانے کے لیے قلم و بیان جیسے سرد ہتھیاروں سے لیکر کلاشنکوفوں جیسے گرم ہتھیاروں تک استعمال کر رہے ہیں ایسے موقع پر اگر کوئی بلند پایہ مذہبی و دینی شخصیت اہل بیت اطہارؑ سے اظہار برائت کرنے یا اس سے ملتا جلتا کوئی فعل انجام دینے پر مجبور کی جاتی ہے تو یہاں اس کا وہی فریضہ ہے جس پر حجر بن عدی و میثم تمار جیسے بزرگوں نے عمل کیا تھا اور تقیہ ترک کرتے ہوئے اپنی جانوں کے بدلے عقیدت و مودّت اہل بیتؑ کے نوخیز پودے کو پروان چڑھایا تھا اگر اس سلسلے میں یہ مذہبی و دینی شخصیت تقیہ کو بہانہ بنا کر کسی قسم کی کوتاہی کا مظاہرہ کرتی ہے تو یہ اس کا اپنے فرائض سے فرار اور آئمہ اہل بیتؑ کے مشن سے جنایت کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا جبکہ اس

کے مقابلے میں عام لوگوں کوفریضہ یہی ہے کہ وہ بغیر کسی عقلی فائدے کے اپنی اور دوسرے مؤمن کی جانوں کوتلف ہونے سے بچائیں اورایسا کوئی جذباتی قدم نہ اٹھائیں جس کا نتیجہ قیمتی جانوں کے تلف ہونے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ پس اظہار برائت کے سلسلے میں منقول روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بعض موارد میں یہ روایات اظہار برائت کومستثنیات تقیہ میں سے قرار دیتی ہیں اور بعض دوسرے موارد میں اظہار برائت مستثنیات تقیہ میں سے نہیں ہوگا بلکہ وہاں تقیہ کرنا ہی فریضہ قرار پائے گا۔

امام حسین علیہ السلام کا تقیہ نہ کرنا

اس تمہید کے بعداب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف آتے ہیں وہ یہ کہ میدان کربلا میں امام حسین علیہ السلام نے تقیہ کیوں نہیں کیا اگر امام عالی مقامؑ تقیہ کر لیتے تو شاید عالم اسلام کو یہ واقعہ پیش نہ آتا؛ یہ وہ شبہہ یا سوال ہے کہ جو مخالفین کے علاوہ خود پیروان اہل بیت کے اذہان میں بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ چونکہ ائمہ اطہارؑ نے تقیہ کی بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ تقیہ کے بارے میں گذشتہ صفحات میں تمہید کے طور پر جو مفصل وضاحت پیش کی گئی ہے اس کی روشنی میں امام حسینؑ کے تقیہ نہ کرنے کے بارے میں چند نکات پیش کیئے جاتے ہیں:

ا۔ قانون تقیہ کا فلسفہ جہاں مؤمنین کی جان و مال اور عزت و آبرو کو بلاوجہ تلف ہونے سے بچانا ہے وہاں دین اسلام کی حفاظت کرنا بھی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ دین اسلام کی حفاظت اہم ترین واجبات میں سے ہے اور کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے کہ جس میں دین و مذہب پر جان و مال اور عزت و آبرو تک قربان کرنا واجب ہوجاتا ہے اور دین کا محفوظ رہنا، جان کی بازی لگا دینے پر موقوف ہوجاتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک خالص اور سچا مؤمن کسی قسم کی مصلحت اندیشی نہیں کرتا چہ جائیکہ امام معصومؑ کہ جس کا فریضہ ہی دین و مذہب کی حفاظت کرنا ہے۔

اسی لیے تقیہ کو احکام پنجگانہ میں تقسیم کیا جاتا ہے یعنی کبھی تقیہ واجب ہوجاتا ہے اور کبھی حرام، کبھی مستحب اور کبھی مکروہ اور کبھی مباح۔ مستثنیات تقیہ میں بھی واضح کیا جاچکا ہے کہ تقیہ اگر انہدام دین کا باعث بن رہا ہو تو وہ وہاں حرام ہوجاتا ہے۔ پس تعلیمات دین اور ارکان اسلام کی حفاظت کے

لیے کبھی تقیہ کرنا واجب ہوتا ہے اور کبھی تقیہ نہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مقصد، دین کی حفاظت ہے خواہ تقیہ کرنے سے انجام پائے خواہ ترک تقیہ سے۔ اسی طرح تقیہ مؤمنین کی جان و مال کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے لیکن اگر تقیہ کرنے سے مؤمنین کی جان وغیرہ تو بچ جائے مگر مذہب و دین پر حرف آئے تو یہاں ترک تقیہ ضروری ہو جاتا ہے۔

۲۔ مسئلہ تقیہ میں مجاری تقیہ کی شناخت ضروری ہے یعنی تقیہ کرنے والے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسے کہاں تقیہ کرنا ہے اور کہاں تقیہ نہیں کرنا۔ تقیہ کے موارد و مجاری سے آگاہی ایک ضروری امر ہے۔ ہوسکتا ہے عام لوگ تقیہ کے موارد کی درست پہچان نہ رکھتے ہوں اور اپنی کم علمی کی بناء پر جہاں تقیہ کرنا چاہیے وہاں تقیہ ترک کر دیں اور جہاں ترک تقیہ ضروری ہے وہاں تقیہ کرنے لگیں اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق اور زندگی کے نشیب و فراز میں صحیح راہ اپنانا اکثر لوگوں کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: **عَلَی العاقِلِ اَن یَکُونِ عارِفاً بِزمانِهِ مُقبِلاً عَلٰی شانِهِ**''۵۰

''عاقل انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے زمانے کو پہچانے اور اپنے فریضہ پر عمل کرے''۔

حقیقی مؤمن کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے زمانے سے آگاہ ہوتا ہے وہ زندگی کے نشیب و فراز کو طے کرنا جانتا ہے اسے دنیا دھوکہ نہیں دے سکتی وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، دین اسلام کے احکام کو جاری کرتا ہے چونکہ دین اسلام ہر زمانے کے لیے ہے پس مؤمن کو بھی چاہیے کہ وہ ہر دور میں دین اسلام پر عمل کرے مگر یہ کام وہی کرسکتا ہے جو احکام دین سے آگاہ ہو اور ''**تفقه فی الدین** '' کی صفت سے متصف ہو۔ اگر ایک مؤمن کے لیے یہ سب باتیں ضروری ہیں تو کیا امام معصومؑ کو ان صفات کا حامل نہیں ہونا چاہیے؟ اور اپنے زمانے کے تقاضوں سے آگاہ نہیں ہونا چاہیے؟ یقیناً امام معصومؑ وہ بھی حضرت سید الشھداء امام حسین علیہ السلام جیسی ہستی، اپنے زمانے کے تقاضوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھی اور احکام اسلام سے بھی مکمل طور پر مطلع تھی۔

امام عالی مقامؑ جانتے تھے کہ کہاں تقیہ کرنا چاہیے اور کہاں تقیہ کے بجائے جان قربان کرنی

چاہیے اور یہ بات ہر وہ مسلمان جانتا ہے کہ جو امام حسین علیہ السلام کے مقام و مرتبے سے آ گاہ ہے۔ یہی صفات عالیہ تھیں کہ جن کی وجہ سے اپنے دونوں نواسوں کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

''اَلحسنُ و الحُسَینُ سَیداشَبابِ اهلِ الجَنَّةِ وَ هُما اِمامانِ قاما أو قَعِدا''۱۵

یعنی ''حسن اور حسینؑ جوانان اہل جنت کے سردار ہیں اور وہ ہر دو امام (و رہبر) ہیں خواہ حالت قیام میں ہوں یا حالت قعود میں''۔

رسول خداؐ کا برسوں پہلے، ان دو اماموں کے بارے میں اس طرح کی وصیت کرنا اسلام میں ان کی عظمت اور قابل اقتداء ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی رسولخداؐ اُمت کو وصیت فرما رہے ہیں کہ حسن وحسین علیہما السلام جس حالت میں بھی ہوں، قابل اقتداء ہیں اور ان کی پیروی کرنی ضروری ہے، خواہ وہ کسی کے ساتھ صلح کی حالت میں ہو یا جنگ کی حالت میں۔ کیونکہ وہ احکام دین سے بھی آ گاہ ہیں اور زمان ومکان کے تقاضوں کو بھی دوسروں کی نسبت بہتر جانتے ہیں۔ پس اگر امام حسن علیہ السلام ، زمانہ معاویہ میں تقیہ کو اپناتے ہوئے اس سے صلح کر لیتے ہیں تو اس میں بھی دین اسلام کی حفاظت امامؑ کے مدنظر تھی اور اگر امام حسین علیہ السلام یزید کے مقابلے میں تقیہ ترک کر کے اعلان جنگ فرماتے تو یہ بھی دین کی حفاظت کے لیے تھا ورنہ یہی امام حسینؑ زمانہ معاویہ میں کئی برس، تقیہ کی حالت میں گزارتے ہیں اور معاویہ کے خلاف قیام نہیں فرماتے کیونکہ امامؑ کی نظر میں معاویہ اور یزید کا زمانہ مختلف تھا اور ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق احکام اسلام پر عمل کیا جاتا ہے۔

تاریخ مسلمین کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یزید کا دور مسلمانوں کی تاریخ میں ایک استثنائی دور تھا۔ ایسا دور کہ جس میں دین اسلام کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ یزید تمام احکام اسلام کو پائمال کر رہا تھا۔ شراب نوشی، عیاشی اور کتوں اور بندروں سے کھیلنا، مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ پر حملہ کرنا، مدینہ منورہ میں قتل و غارت یہ سب یزید کے کارنامے تھے کہ جن سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ایسی حالت میں کوئی بھی حقیقی مؤمن خاموشی اختیار نہیں کر سکتا تھا، چہ جائیکہ امام حسین علیہ السلام جیسی ہستی کہ جو خود محافظ دین تھے وہ کیسے احکام دین کو اس طرح پائمال ہوتا دیکھتے۔ گو کہ یزید کے

لیے یہ سب مقدمات اس کے باپ معاویہ نے فراہم کیئے تھے لیکن وہ خود زیرک تھا، کھلے عام احکام اسلام کی خلاف ورزی نہیں کرتا تھا اور محافظین دین کو اپنے خلاف قیام کرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔اس نے یزید کو بھی یہی وصیت کی تھی کہ کھلے عام احکام دین کی توہین نہ کرنا، فلاں فلاں بزرگان دین سے نہ ٹکرانا، سیاست سے کام لینا لیکن یزید اس قدر عیاش، بے دین اور لاابالی تھا کہ اس نے اقتدار کی کرسی پر قدم رکھتے ہی دین اسلام کی جڑیں اکھاڑنی شروع کر دیں۔اگر یزید کو اس طرح کھلی چھٹی دے دی جاتی تو آج نہ تو روئے زمین پر احکام اسلام باقی رہتے اور نہ ہی کوئی سچا مسلمان باقی رہتا۔

اس کے علاوہ یزید، امام حسین علیہ السلام کو اپنی بیعت کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔یعنی وہ چاہتا تھا کہ امام عالی مقامؑ اس کی بیعت کر کے اس کے تمام غیر شرعی کاموں پر مہر تصدیق ثبت کر دیں۔کیا ایسے حالات میں، امام علیہ السلام خاموش رہتے اور تقیہ کے بہانے دین کی ہر پائمالی کو دیکھتے رہتے، جبکہ یہ سب حسینؑ بن علیؑ جیسی ہستی سے بعید تھا اور پھر یزید نے امام حسین علیہ السلام کی موت وحیات کو اپنی بیعت میں منحصر کر دیا تھا لیکن امامؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

"وَمِثلِی لاٰ یُبایِعُ مِثلَهُ" ۵۲ یعنی "مجھ جیسا، اس جیسے کی بیعت نہیں کرتا"۔

پس امام علیہ السلام کا ایک ہی فیصلہ تھا کہ میں نے یزید کی بیعت نہیں کرنی چونکہ اس بیعت کا مطلب، تمام احکام دین کی پائمالی کو قبول کرنا ہے اور امام معصومؑ مفترض الطاعۃ کا یزید جیسے خلیفہ کی بیعت کرنے سے اسلام کا مٹ جانا یقینی تھا۔اور جہاں یقین ہو جائے کہ ترک تقیہ سے اسلام مٹ جائے گا تو وہاں تقیہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے! وہ بھی امام معصومؑ کے لیے۔

۴۔ان سب باتوں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام جانتے تھے کہ اس معرکہ حق و باطل میں میری قربانی، مطلوب خداوند ہے اور یہ تقدیر الٰہی ہے کہ حق وحقیقت کے لیے ایک مقدس ترین ہستی اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے اور پھر بہت سی احادیث نبویؐ میں بھی امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور بنی امیہ کی طغیانی کی پیش گوئی کی گئی تھی اور یہ ایک ایسی واقعیت تھی کہ جس کو خود امام حسین علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

''إِنَّ اللہَ شٰاءَ اَن یَـراٰنِی قَتِیلاً وَاَن یَـراٰھُنَّ سَبٰایاً'' ۵۳ یعنی ''بتحقیق خداوند مجھے مقتول دیکھنا چاہتا ہے اور انھیں (مخدرات عصمت کو) اسیر''۔

پس امام حسین علیہ السلام دین اسلام کی سربلندی اور حفاظت کے لیے تقدیر الٰہی کے اس فیصلے سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ فقط میری قربانی سے ہی اسلام بچ سکتا ہے جب ایک شجاع شخص ایسے حالات سے دوچار ہو جائے تو اس کے لیے موت کوئی معنی نہیں رکھتی اور وہاں تقیہ جیسے مفاہیم اپنی اہمیت کھو دیتے ہیں۔لہذا علم امامؑ اور واقعہ کربلا کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کے فرمودات کے بعد ترک تقیہ ہی بہترین راستہ تھا۔

۵۔ بالفرض، یہاں ہم تقیہ کو رخصت شرعی کے معنی میں بھی لیں تو بھی امام حسین علیہ السلام جیسی ہستی کہ جو ایثار و قربانی اور شجاعت و دلیری کا نمونہ ہے، رخصت کے بجائے شہادت ہی کو ترجیح دیتی کیونکہ امام عالی مقامؑ نے وہی راستہ اپنانا تھا جو خداوند کے نزدیک زیادہ محبوب تھا اور آپؑ نے اسی فریضہ پر عمل کرنا تھا جو خدا کے نزدیک زیادہ فضیلت کا حامل تھا چونکہ رسول خداؐ کا فرمان ہے: ''اَفضَلُ الأعماٰلِ اَحمَضُھاٰ'' یعنی خداوند کے نزدیک افضل ترین کام وہ ہے جو زیادہ سخت ہے اور پھر امامؑ خداوند کے فرمان:

﴿فَضَّلَ اللہُ المُجاٰھِدِینَ عَلٰی القاٰعِدِینَ اَجرًا عَظِیماً﴾ ۵۴

سے بھی آگاہ تھے اور فضیلت جہاد کو جانتے تھے لہذا ایسے حالات میں کہ جن میں اس وقت دنیائے اسلام گرفتار ہو چکی تھی، جہاد کرنا اور خدا کی راہ میں شہید ہو جانا ہی امام حسین علیہ السلام کے لیے زیادہ پسندیدہ تھا نہ کہ تقیہ جیسی رخصت شرعی پر عمل کرنا اور پھر امام عالی مقامؑ نے ایسا ہی کیا اور قیام و شہادت کو تقیہ پر ترجیح دے کر ہمیشہ کے لیے اسلام کے سچے پیروکاروں کا راستہ معین کر دیا کہ جب بھی احکام دین پر حرف آئے تو شرعی رخصت کے بجائے شہادت و فداکاری کا راستہ اپنانا زیادہ فضیلت رکھتا ہے کیونکہ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللہَ یُحِبُّ أن یُؤخَذَ بِرُخَصِة کَماٰیُحِبُّ أن یُؤخَذَ بِعَزاٰئِمِهِ﴾ ۵۵ یعنی ''بتحقیق خداوند جس طرح اپنی رخصتوں پر عمل کو پسند فرماتا ہے اسی طرح اپنے قطعی احکام پر عمل کو بھی پسند کرتا ہے''۔

حوالہ جات:

(۱) الصحاح، (اسماعیل بن حماد جوھری)، مادہ وقی۔
(۲) کتاب المکاسب، ج ۳، ص ۱۲۷ (رسالۃ فی التقیۃ)
(۳) مئومن (غافر)، آیت ۴۵۔
(۴) آل عمران، آیت ۲۸۔
(۵) مجمع البیان، سورہ آل عمران ذیل آیہ ۲۸۔
(۶) تصحیح الاعتقاد الامامیہ، ص ۱۳۷۔
(۷) کتاب المکاسب، ج ۳، ص ۱۲۷ (رسالۃ فی التقیۃ)۔
(۸) مجمع البیان، ج ۲، ص ۷۲۹۔
(۹) التبیان، ج ۲، ص ۴۳۴۔
(۱۰) القاعدۃ الفقہیۃ الامامیہ، ص ۱۔
(۱۱) التفسیر الکبیر، ج ۸، ص ۱۲۔
(۱۲) فرھنگ اصطلاحات فقھی، ص ۱۴۔
(۱۳) اصطلاحات الاصول، ص ۱۲۱۔
(۱۴) حکم ثانوی در تشریع اسلامی، ص ۲۰۶۔
(۱۵) وسائل الشیعہ، ج ۱۶، ص ۲۱۴، باب امر بالمعروف ونہی عن المنکر، باب ۲۵، ح ۲۔
(۱۶) کتاب المکاسب، ج ۳ (رسالۃ فی التقیہ)، ص ۱۲۹۔
(۱۷) القواعد والفواعد، ج ۲، ص
(۱۸) ایضاً
(۱۹) تفسیر الکبیر، ج ۸، ص ۱۲۔
(۲۰) وسائل الشیعہ، ج ۱۶، ص ۲۲۲، کتاب امر ونہی، باب ۲۸، ح ۳۔

(۲۱)الرسائل العشر ہ(التقیہ)،ص۳۴۔

(۲۲)اصول کافی، ج۲،ص۱۲۳، کتاب ایمان وکفر، باب المدارا، ح۴۔

(۲۳)ایضاً، ح۴۔

(۲۴)وسائل الشیعہ ، ج۱۶،ص۲۰۷، کتاب امر ونہی، باب۲۴، ح۱۴۔

(۲۵)سورہ آل عمران، آیت۱۰۳۔

(۲۶)الرسائل العشر ہ(التقیہ)،ص۸۔

(۲۷)الرسائل العشر ہ،ص۹۔

(۲۸)الرسائل العشر ہ،ص۱۳۔

(۲۹)ایضاً،ص۱۴۔

(۳۰)وسائل الشیعہ ، ج۱۶،ص۲۱۶، کتاب امر ونہی، باب۲۵، ح۶۔

(۳۱)ایضاً، ح۷۔

(۳۲)ایضاً، ح۵۔ (۳۳)ایضاً، ح۳۔

(۳۴)جواہر الکلام، ج۲،ص۲۳۷۔

(۳۵)دیکھئے سورہ بقرہ، آیت۱۹۶۔

(۳۶)دیکھئے سورہ بقرہ، آیت۶۔

(۳۷)تقیہ سپری برای مبارزۂ عمیق تر،

(۳۸)جواہر الکلام، ج۲،ص۲۳۷، مرآۃ العقول، ج۹،ص۱۶۷۔

(۳۹)وسائل الشیعہ ، ج۱، کتاب الطھارۃ، ابواب وضو، باب۳۸، ح۵۔

(۴۰)جواہر الکلام، ج۲،ص۲۳۷۔

(۴۱) وسائل الشیعہ ، ج۱۶،ص۲۳۴، کتاب امر ونہی، باب۳۱، ح۱۔

(۴۲)السرائر، ج۲،ص۲۵۔ جواہر الکلام، ج۲۲،ص۱۶۹۔

(۴۳)وسائل الشیعہ ، ج۱۶،ص۲۲۸، کتاب امر ونہی، باب۲۹، ح۸۔

(۴۴)ایضاً، ح۹۔ (۴۵)ایضاً، ح۱۲۔

(۴۶)الرسائل العشرہ (رسالۃ فی التقیہ)،ص۲۸۔

(۴۷)وسائل الشیعہ، ج۱۶،ص۲۲۹، کتاب امر ونہی، باب۲۹، ح۲۔

(۴۸)سورۂ بقرہ، آیت۱۹۵۔

(۴۹)وسائل الشیعہ، ج۱۶،ص۲۲۶، کتاب امر ونہی، باب۲۹، ح۳۔

(۵۰)بحارالانوار، ج۵،ص۲۴۲(طبع قدیم)۔

(۵۱) بحارالانوار، ج۴۳،ص۲۶۵۔

(۵۲) سخنان حسین بن علیؑ از مدینہ تا کربلا،ص۱۴۴۔

(۵۳) ایضاً، ص۸۹۔

(۵۴) سورہ نساء، آیت۹۵۔

(۵۵) وسائل الشیعہ، ج۱۱،ص۲۸۱۔

☆☆☆☆☆

عاشورہ حسینیؑ کے تناظر میں؛ تکامل انسان اور عورت کا کردار

حجت الاسلام جعفر خوارزمی

پاک ومنزہ ہے ذات پروردگار جس نے اپنے جمال وجلال کیساتھ کون ومکان کی تخلیق فرمائی۔ ہر ذرہ کو مناسب قطر واندازہ عطاء فرمایا۔ کائنات کو اپنے حسن وجمال سے زیبائی عطاء فرما کر بہترین گھڑی میں دنیا کو انسانی حیات کے لئے تخلیق فرمایا۔ اس کو تمام تر زیبائیوں اور تازگیوں سے مالا مال فرمایا۔ پھر خلاّق عالم نے اپنے ارادے سے انسان کی تصویر گری فرمائی اور اسے بہترین صورت عطاء فرمائی۔ پھر خود اپنے امر سے تن بے جان خاکی کو روح سے زندگی عطاء فرمائی۔

لطیف وخبیر ہے وہ ذات جس نے نظام ہستی کی تخلیق، انسانی ضروریات کے مطابق فرمائی۔ اور اس سب کچھ کے بعد خلاّق عالم نے اپنی تعریف فرمائی کے ''فتبارَکَ اللهُ اَحْسَنُ الْخَالِقین'' یعنی اللہ کی ذات پر آفرین ہے جو بہترین خالق ہے۔

قادر متعال نے اس دنیا میں انسان کی جسمانی اور روحانی ضرورتوں کو مکمل طور پر پورا فرمایا ہے۔ انبیاء عظام علیہم السلام اور اپنے آسمانی صحیفوں کے ذریعے انسان کی روحانی نشو ونما کا بندوبست فرمایا تا کہ انسان خاک سے افلاک کی جانب عروج حاصل کر سکے۔ درحقیقت انسان کی تخلیق کا مقصد بھی یہی ہے، جیسا کہ قرآن میں خدای تعالی فرماتا ہے کہ '' وَمَا خَلَقْتُ الجِنّ وَ الانْسَ الاّ لیَعبدُون '' یعنی جن وانس کو صرف عبادت کے لئے خلق فرمایا ہے اور کوئی بھی عبادت بغیر عرفان و پہچان کے مکمل نہیں ہوسکتی۔ یعنی عبادت سے قبل معبود کی پہچان، اس کی عطا کردہ نعمتوں کی پہچان اور حق و باطل کی پہچان لازمی ہے۔ حتی معرفت سے متعلق زیارت کریمہ اہل بیتؑ حضرت معصومہؑ قم میں آیا ہے کہ ''ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی معرفت ہم سے سلب نہ فرمائیں۔'' اس سے واضح ہوتا ہے کہ عرفان ومعرفت بھی عطاء وسلب ہوسکتی ہے۔

اسی ہدایت کی ایک کڑی انبیاؑ اور دوسرے ائمہ طاہرین علیہم السلام ہیں۔ یہ سب انسان کی

بھلائی اور تربیت وتعلیم کے لئے خدای تعالی نے فراہم کیا ہے۔ اللہ تعالی نے انسان کو انبیاؑ، ائمہؑ اور اپنے نیک بندوں کے ذریعے تربیت وتعلیم عطا فرمائی ہے۔ دین اسلام مرد وعورت کے لیے مساوات کا قائل ہے اور خدا کے نزدیک دونوں مساوی ہیں۔ قانون اور شریعت کے نزدیک بھی یہ دونوں مساوی ہیں۔ وہ چیز جو انہیں ایک دوسرے پر برتری دیتی ہے ان کا اخلاق وکردار اور تقویٰ ہے۔ جیسا کہ قرآن میں رب العزۃ کا فرمان ہے:" اِنّ اَکرَمَکُم عِندَ اللّٰهِ اَتقٰیکُم '' ، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے کریم اور بلند مرتبہ وہ ہے جو تم میں زیادہ باتقوی ہے۔

یعنی خدا کے ہاں معیار ایمان وعمل صالح ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کی شخصیت میں بے حد مئوثر ہے۔ متقی افراد اپنے اندر تمام وہ اوصاف جمع کر لیتے ہیں جو خدا نے انسانوں کے لیے پسند فرمائے ہیں۔ اولاد کی تربیت میں تمام نیک صفات کا ماں میں موجود ہونا اور ناپسندیدہ صفات سے بری ہونا نہایت اہمیت رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولای کائنات جناب امیر اللمومنین علیؑ نے جناب فاطمہ زہرا علیھا سلام کی شھادت کے بعد جب تجدید فراش کرنا چاہا تو اپنے بھائی عقیل سے عرض کیا کہ میرے لیے کسی دلیر خاندان سے زوجہ انتخاب کرو! جناب عقیل نے جناب فاطمہ ام البنینؑ کو انتخاب فرمایا جن سے جناب عباس علمدار علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ ماں کے اوصاف کا بچے کی شخصیت پر نہایت گہرا اثر ہوتا ہے۔ انسان کی تربیت کا آغاز اس کے دنیا میں قدم رکھنے سے قبل ہو جاتا ہے۔ خدای تعالی نے قرآن میں اس بارے میں فرمایا ہے:

" وَاللّٰهُ اَخرَجَکُم مِن بُطونِ اُمّھاتِکُم لا تَعلَمُونَ شَیئاً وَ جَعلَ لکُم السّمْعَ وَ الابْصارَ و الافئِدَۃَ لَعلّکم تَشکُرون '' خدا نے تمھیں تمہاری ماؤں کے بطن سے پیدا کیا جبکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور جوارح قرار دئے تا کہ تم شکر اداء کرو۔ (سورہ نحل ۷۸)

گویا اس آیت میں رب کریم نے انسان کو توجہ دلا کہ اسے عطاء کردہ نعمتیں یاد دلائی ہیں۔ قوت سماعت، قوت بصارت اور اعضاء وجوارح کو ایک خاص ترتیب سے خلق فرمایا ہے، جس میں قوت

سماعت کوقوت بصارت پر ترجیح دی ہے۔ حالانکہ انسان کے لئے دیکھنا، سننے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔لیکن قرآن میں متعدد بار سماعت کو بصارت سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ انسان میں انسانی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

''انا خلقنا الانسان من نطفةٍ امشاجٍ نبتليه فَجَعلناه سَميعاً بصيراً ''سورہ انسان آیت۲ یعنی ہم نے انسان کو نطفہ سے خلق کیا تا کہ اسے آزمائیں اسی لئے اسے سماعت و بصارت عطاء فرمائی۔

اوراس کی ایک وجہ یہ ہے کہ خلقت انسان کے وقت جب بچہ ماہ کےبطن میں ہوتا ہے تو پہلے سننے کی قوت کا آغاز ہوتا ہے۔۴ ماہگی سے بچہ صاحب روح ہوجاتا ہےاوراسی وقت سے وہ آوازوں کو سننا شروع کردیتا ہے، پھر پہچاننا شروع کرتا ہے۔حتی جدید علوم اورٹیکنالوجی نے بھی اس بات کوثابت کردیا ہے۔گذشتہ سال ۲۰۰۵ میں ایک امریکی تحقیقاتی ادارے National Geographic Society نے ایک جامع تحقیق انجام دی جس میں ایک حاملہ خاتون کونوں ماہ تک جدید آلات کے ذریعے۲۴ گھنٹوں تحت نظر رکھا گیا۔ان آزمایشات میں خوراک، ماحول اور ماں کے حالات کا بچے پر پیدا ہونے والے اثرات کا نہایت دقت کے ساتھ جائزہ لیا گیا۔اس دوران ایک آزمائش جسے کئی بار آزمایا گیا، وہ ماں اور بچے کے درمیان ایک خاص رابطہ اور ہماہنگی تھی یعنی ماں اور بچے کے احساسات یکسان تھے۔

اگر ماں کسی چیز سے چونک جاتی یا خوف محسوس کرتی تو بچے پر بھی وہی اثر پڑتا۔اسی طرح اگر کوئی چیز ماں کے مزاج کو پسند نہ آتی تو وہ بچے کو بھی نہ بھاتی۔ بچہ چار پانچ مہینے سے ماں کی آواز پہچانتا ہے، ماں کے جذبات سمجھتا ہے، احساسات کا بخوبی ادراک کرتا ہے۔ درحقیقت بچہ ماں کی آنکھوں، کانوں اوراحساسات کے ذریعے باہر کے ماحول کا ادراک کررہا ہے۔ درایں اثناء ماں کے ذریعے بچہ دوسرے افراداوراشیاء سے معرفت حاصل کرتا ہے۔

انسان کی تربیت کا آغاز ماں کی گود سے ہوتا ہے جیسا کہ حدیث نبویﷺ میں ہے:'' اُطْلُبُوا الْعِلمَ

مِن المَهْدِ الی اللّحَد" گود سے گور تک علم حاصل کرو۔اس کا مطلب ہے کہ ماں کی گود انسان کی سب سے پہلی درسگاہ ہے۔ بے شمار احادیث میں اہل بیت علیہم السلام نے فرمایا ہے کہ بچے کی دینی پرورش کا آغاز نوں ماہ سے ہوتا ہے کہ جب وہ ماں کہ جسم کا حصہ ہوتا ہے۔جیسا کہ بہت سے علماء کی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ دو چیزوں کا ان کی تربیت میں بہت زیادہ اثر تھا: ایک تولد سے قبل ماؤں کا دینی محافل میں شرکت کرنا،قرآن کریم سے انس اور آیات الٰہی کی باقائدہ تلاوت اور دوسرا تولد کے بعد بچے کو باوضو ہوکر دودھ پلانا۔اکثر حافظان قرآن ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے جن میں قرآن و مذہب کو اہمیت دی جاتی ہے۔یعنی بچے نے یا ماں کے آغوش میں یا پھر کمسنی میں تلاوت قرآن سنی ہے۔اسی طرح رزق حلال نیک اولاد کی پرورش میں نہایت مئوثر ہے۔

لیکن شیطانی قوتوں نے تاریخ میں انسانی اخلاق و کردار کو مسمار کرنے کی انتھک کوشش کی ہے اور اس درمیان سب سے زیادہ ظلم خواتین پر ہوا ہے۔کبھی عورت زندہ دفنا دی جاتی،کبھی عورت کو زینت کا وسیلہ بنایا جاتا،کبھی عورت کو آزادی کے نام پر فساد و فحشا کا نشانہ بنایا جاتا،کبھی عورت تمدن و ترقی کے نام پر ہوس کا نشانہ بنتی اور کبھی عورتوں کے نام پر تساوی حقوق کا نعرہ لگا کر سیاست بازوں نے انے ناپاک مقاصد کے لئے استعمال کیا۔یہ سب اس لئے ہوتا رہا کہ عورت کو ضعیف اور کمزور سمجھا جاتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں مغربی اقوام میں تو عورت سے جانوروں سا سلوک کرتے تھے۔عورت کو اپنی ملکیت سمجھتے اور اس کو اپنے گھریلو کام کاج کے لئے استعمال کرتے۔

نہ عورت کو حق انتخاب دیتے نہ ہی اس کے لئے کوئی حقوق معین کیے تھے۔جب چاہتے اسے گھر سے نکال دیتے،کسی کو بخشش کر دیتے یا پھر غلاموں کی طرح اسے خرید و فروش کرتے۔آج بھی مغربی تمدن میں عورت صرف حوس اور مردوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ایک صدی پہلے تک عورت کو نہ ووٹ دینے کا حق تھا اور نہ ہی اسے اپنے لئے کسی قسم کا حق انتخاب حاصل تھا۔یہ اسلام ہے جس نے عورت کو مقام بلند مقام و منزلت عطا کی ہے۔

الغرض معاشرے کی سب سے پہلی اور سب سے مؤثر درسگاہ ماں کی گود ہے جو ہر شخص کی

تربیت، تزکیہ نفس اور اخلاق میں بنیادی کردار اداء کرتی ہے۔ تاریخ خود بہترین گواہ ہے کہ ہر کامیاب انسان کے ہمراہ ایک باکردار عورت کا ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ناموفق انسان کے پیچھے بھی ایک بے کردار اور ناموفق عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ خدا کے عظیم نبیؑ، ائمہ اطہارؑ، اولیاء اور اوصیاء کے ساتھ کم از کم ایک باکردار، قوی ہمت اور مضبوط ارادہ خاتون دیکھائی دیتی ہے۔ جو کبھی ایک ماں، بہن، بیوی، پھوپھی یا خالہ کی صورت میں کردار ادا کرتی ہے۔ نیک عورت خدا کی جانب سے نیک لوگوں کو ان کے نیک اعمال کا صلہ ہے۔

یہ ایک عطیہ الٰہی ہے۔ گویا کہ خدا نے ارادہ فرمادیا ہے کہ ہر نبیؑ و امامؑ بلکہ ہر صالح بندے کی پیدائش و تربیت عفیف و پاکدامن ماؤں کی گود میں انجام پائے گی۔ بلکہ یہاں تک کہ بچے کی تربیت میں ماں کا سایہ باپ کی نسبت زیادہ ضروری اور مئوثر بتایا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کے بسا اوقات بچوں کی پیدائش باپ کی وفات کے بعد ہوئی جیسا کہ بہت سے انبیاء کی ہوئی۔ جیسا کہ جناب رسالتمآب ﷺ کی تاریخ میں ملتا ہے۔ بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں تو باپ کا وجود ہی نہیں لیکن خدا نے ثابت کردیکھایا کہ پیدائش و پرورش کے لئے ماں کا وجود نہایت ضروری ہے۔ عورت نہ صرف ایک فرد کی بلکہ قوم وملت کی کردار سازی کرتی ہے۔

اسی لیے اسلام مردوں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کی خاص توجہ دلائی ہے بلکہ یکساں طور پر دونوں کی تعلیم کو فرض قرار دیا ہے۔ رسول اعظم اسلام ﷺ کا فرمان ہے: "**طَلَبُ العِلمِ فَریضةٌ علیٰ کلِ مسلمٍ و مسلمةٍ**" علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی تعلیم اسی حد تک ضروری ہے جس قدر مرد کی تعلیم۔ بلکہ یہ کہنا نا بجا نہ ہوگا کہ عورت کی تعلیم کی اہمیت کسی لحاظ سے بھی مرد سے کم نہیں بلکہ شاید کہیں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ایک مرد علم حاصل کرکے زیادہ سے زیادہ اپنے گھر کے لے مفید واقع ہوسکتا ہے جبکہ عورت کی تعلیم کا اثر گھر و گھرانے سے بڑھ کر شہر ومعاشرے تک پھیل جاتا ہے۔

ایک مہذب عورت ہی بہترین انسانی تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھ سکتی ہے۔ ایک باکردار اور

مضبوط ارادہ عورت ہی دلیر قوم کو جنم دیتی ہے۔ ایک پرہیز گار وصاحب تقویٰ عورت ہی متقی وعبادت گزار بندے تربیت کرتی ہے۔ بالاخر یہ ماں ہی ہے جو ابتدا میں اپنے بچے کی تربیت کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے پروان چڑھنے کے لیے مناسب ماحول فراہم کرتی ہے۔ اپنے گھریلو ماحول اور معاشرے کی فضاء کو اپنے اور دیگر بچوں کے لیے مہیا کرتی ہے۔ گویا جس معاشرے میں بھی تعلیم یافتہ خواتین کی کثرت ہوگی وہاں نہ صرف گھر کا ماحول بلکہ معاشرہ بھی انسانی نشوونما کے لیے نہایت سازگار ہوگا۔ جیسا کہ مشہور ہے انسان کا لباس اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اسی طرح ایک پاک و پاکیزہ ماحول اور صاف ستھرا محلّہ وہاں بسنے والوں کی شخصیت کی مفسر ومبیّن ہوتا ہے۔ یعنی ایک صاف ستھری گلی، پاکیزہ در ودیوار اور مھذب لوگ پڑھے لکھے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایک مناسب تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون گھریلو معاملات سے لے کر اہم اجتماعی امور میں قوم وملت کے لیے نہایت مفید وکارآمد واقع ہوسکتی ہے۔ عورت کو خدا نے سکون وآرامش کا سبب بنایا ہے۔ یعنی عورت اپنے گھر میں اور معاشرے میں باعث سکون وآرامش ہوتی ہے۔ قرآن کی سورہ روم کی آیت ۲۱ میں خدا فرماتا ہے کہ ''**وَ مِن آیاتِہِ ان خَلقَ لَکُم من اَنفُسکم ازواجاً لتَسکُنُوا الیھـــا**'' خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم میں سے تمہارے لیے بیویاں خلق فرمائیں تاکہ ان کے ساتھ سکون حاصل کرسکو۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے مردوں کی تندخوئی کے مقابلے میں عورتوں کو نرم ولطیف مزاج عطا کیا ہے۔ عورت کو خدای تعالیٰ نے ایسا عظیم صبر وحوصلہ عطا فرمایا ہے کہ اس میں بڑی سے بڑی مشکل کو برداشت کرنے کی طاقت ہے۔ اسی طرح عورت اپنے حوصلے اور بردباری سے مسایل کو نہایت دقت کے ساتھ حل کرنے کی طاقت ہے۔ خدا نے اپنے جلال سے مردوں کو اور جمال سے عورتوں کو نوازا ہے۔

جدید تحقیقات کہ مطابق مردوں کی نسبت خواتین، دفاتر میں آفس سیکٹری کا کام نہایت خوش اصلوبی سے انجام دیتی ہیں کیونکہ ان میں غصّہ برداشت کرنے اور افراد کے درمیان حسن روابط ایجاد کرنے کی توانائی ہوتی ہے۔ ایک مہذب عورت سے نہ صرف معاشرے میں لڑائی جھگڑے جنم نہیں

لیتے بلکے اس کا وجود معاشرے کو سکون و آرامش مہیا کرتا ہے۔تمام مسایل کا آغاز گھر میں نامناسب ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے جس وقت شوہر اور بیوی کے تعلقات خراب ہوتے ہیں۔گھروں کے جھگڑے معاشرے میں نا امنی کا باعث بنتے ہیں اور یہ سلسلہ آگے چل کر قوم وملت کے لیے عدم استحکام کا باعث بنتا ہے۔لیکن اگر ابتدا ہی میں مسائل کو حل وفصل کرلیا جائے تو نہ صرف گھر و معاشرہ ہر قسم کی تباہی سے محفوظ رہ جاتا ہے بلکہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی جنم لیتی ہے جو آئندہ نسلوں کی بہبود و سلامتی کی ضمانتدار ہوتی ہے۔جس گھر میں بچے اپنے والدین کی مکمل توجہ اور محبت پاتے ہیں، ان کے وجود میں خود اعتمادی اور محبت جنم لیتی ہے۔

جن گھروں میں والدین کے مابین ناچاکی اور دشمنی پائی جاتی ہے وہاں پرورش پانے والے بچے ذہنی توانائیوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔وہ زیادہ وقت خیالی دنیا میں گزارتے ہیں، جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں، اخلاقی بے راہ روی کا شکار ہوتے ہیں، نا قابل اعتماد و نا قبل بھروسہ شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں۔درنتیجہ گھر میں بے توجہی اور بے حسی کی وجہ سے انکی شخصیت مجروح ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے سکول میں انہیں وہ سزائیں سہنی پڑتی ہیں جن کے وہ حقدار نہیں تھے۔بچے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے والدین اور اساتذہ کو قصوروار سمجھتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے لیے گھر اور اسکول کی فضا مکمل طور پر اجیراًبن جاتی ہے۔

ان تمام مشکلات کا سرچشمہ والدین اور خصوصاً ماں کا کردار ہے، جو آغاز ہی میں ان تمام مسایل کو نہایت خوش اسلوبی سے حل وفصل کرسکتی ہے۔یہاں پر یہ سمجھنا کے عورت قربانی کا بکرا بن رہی ہے سراسر غلط بلکہ نافہمی ہوگی اس لیے کے ایک پڑھا لکھا معاشرہ اپنے مسایل کو باہمی صلاح مشورہ سے حل وفصل کرتا ہے جس میں کبھی مرد اور کبھی عورت معذرت کی پالیسی کو بروئے کار لاتے ہیں، اور اگر ایک گھر ،صرف ایک لفظ معذرت سے بچ سکتا ہے تو اس میں ہار کسی کی نہیں بلکہ یہاں پر قابل قدر وہ ہے جس نے معذرت میں پہل کی۔

البتہ اور صد البتہ اگر ابتدا ہی سے گھرانے میں عشق ومحبت کی فضا قائم ہو تو کبھی افراد میں کسی

قسم کی کمی واقع نہ ہوگی۔ایک مہذب مذہبی گھرانے میں عورت مرکزی کردار اداء کرتی ہے۔درحقیقت ماں افراد خانہ کو باہم متصل کرتی ہے اور انکے درمیان مناسب انس ومحبت برقرار رکھتی ہے۔واضح سی بات ہے کہ جب کبھی افراد خانہ کے درمیان کم توجہی پیدا ہوتی ہے اس کے منفی اثرات پورے گھر پر رونما ہوتے ہیں۔ماں اپنی مہربانی اور شفقت سے بھری ممتا کے ذریعے، جواس کو خداوند ارحم الراحمین کا خاص عطیہ ہے، گھر کو جنّت میں تبدیل کر سکتی ہے۔یہ چیز اہلبیت اطھار علیہم السلام کے ہاں بھی ملتی ہے۔ رسول اعظم اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ نے ۲۴ ذی الحجۃ الحرام عید مباہلہ کے روز جناب فاطمہ زہرا علیہا سلام کو درمیان میں قرار دے کر ثابت کر دیکھایا کہ اہلبیت علیہم السلام کہ درمیان محور و مرکز بی بی دو عالم حضرت فاطمہ علیہا سلام ہیں۔

درحقیقت مرد وعورت ایک دوسرے کے مکمّل ہیں یعنی مرد کے بغیر عورت نامکمل ہے اور عورت کے بنا مرد۔اسی لیے خالق یکتا وعلیم نے مرد وعورت کو دو مختلف مزاج عطاء کیے ہیں تا کہ دونوں مل کر ایک پرُ مہر وروح فزا ماحول کی تشکیل دے سکیں جس میں اعلی انسان نشو ونما پاسکیں۔قرآن کریم میں خدا نے مرد وعورت کو ایک دوسرے کا لباس تعبیر کیا ہے جہاں سورہ بقرہ ۱۸۷ میں فرماتا ہے ''**هُنَّ لباسٌ لکم و انتم لباسٌ لهُنَّ**'' وہ تمہارے لیے حجاب اور تم ان کا حجاب ہو۔یعنی ایک دوسرے کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہو۔گویا کہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

مرد کو بیرون منزل کے دشوار امور انجام دینے کے لیے اور عورت کو اندرون خانہ کے امور نمٹانے کے لیے بنایا ہے۔جیسا کہ احادیث میں بھی اشارہ ملتا ہے کہ جناب رسول اعظم اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ نے جناب سیدۃ النساء العالمین فاطمہ زہرا علیہا سلام اور جناب امیر اللمومنین علی علیہ السلام سے نکاح کے موقع پر خطاب فرمایا:

''یا علیؑ! بیرون خانہ کے امور آپ کے ذمہ اور درون خانہ کی ذمہ داریاں فاطمہؑ کے سپرد!''

اس موقع پر دُخت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ جناب بطولؑ نے اظہار مسرّت فرمایا۔جیسا کہ جب جناب فاطمہؑ علیہا سلام سے پوچھا گیا کہ ایک عورت کے لیے کیا چیز باعث سعادت ہے؟ آپؑ نے فرمایا ''نہ کوئی

(نامحرم) اسے دیکھے اور نہ وہ کسی (نامحرم) کو دیکھے۔''

البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خواتین معاشرے میں ایفاء نقش نہ کریں اور اپنا مثبت کردار اداء نہ کریں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت عفت وطہارت کہ حجاب میں رہتے ہوئے اپنا کردار اداء کرے۔ جناب بتول علیہا سلام کہ اس کلام کا مقصد معاشرے میں عورت کا مقام محفوظ رکھنا اور حوس و شہوت کا سدباب کرنا ہے۔ حجاب کی حکمت بھی یہی ہے کیونکہ عورت کا حسن و جمال صرف اس کے شوہر کے لیے ہے اور اس کا شیرین لب ولہجہ اور لطیف مزاج اولاد کی بہتر تربیت کے لیے ہے۔ تمام آسمانی و الہی خواتین نے اپنے زمانے کے اولیاء اور اوصیاء الہی کی مدد ونصرت کی ہے۔

اسلام میں بھی بانوی اول اسلام جناب خدیجۃ الغرّاء نے اسلام کے آغازین دور میں اپنے مال سے دین اسلام اور مسلمانوں کی مدد ونصرت فرمائی اور اپنی شفقت ومہربانی سے رسول اللہ ﷺ کو دلگرمی اور حوصلہ عطاء فرمایا۔ اسی طرح سیدۃ النّساء العالمین جناب فاطمہ زہراء علیہا سلام نے بھی جنگوں اور غزوات میں دیگر مسلمان خواتین کے ہمراہ زخمیوں کی تیمارداری کے فرائض انجام دیے ہیں اور اسی طرح جب ضرورت پیش آئی تو امامت وولایت جناب امیر اللمومنین علی علیہ سلام کے دفاع کے لیے اور امت کو صحیح راستہ دیکھانے کے لیے چادر عصمت اوڑھ کر انصار ومہاجرین کے گھر گھر جا کر انہیں غدیر خم میں بیعت مولا علیؑ یاد دلائی۔

یہاں تک کہ بھری مسجد میں مسلمانوں کے سامنے لب ولہجہ رسول ﷺ میں وہ عظیم تاریخی و یادگار خطبہ بیان کیا جس سے تاریخ پر حقیقت ہمیشہ کے لیے آشکار ہوگئی۔ بلکہ وقت آنے پر جناب سیدہ علیہا سلام نے امامت وولایت کی حفاظت میں اپنی جان تک قربان کردی۔ جناب فاطمہ زہراؑ کی گود میں پرورش پانے والی ثانی زہراؑ محافظہ انقلاب عاشورہ زینب علیہا سلام نے بھی دوران حیات حجاب کی قداست رکھتے ہوئے معاشرے میں خواتین کی تعلیم وتربیت کا مقدس کام جاری رکھا۔ امیر اللمومنین علیؑ کے دوران حکومت میں جناب زینب علیہا سلام نے شہر کوفہ میں ۲۰۰۰ سے زائد خواتین اور بچیوں کے لیے تعلیمی سلسلہ کا انعقاد فرمایا اور بذات خود بچیوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیتی تھیں۔ تاریخ گواہ ہے

کہ اس عظیم مخدرہ نے، کے جن کو حتی بنی ہاشم نے کبھی دن میں گھر سے باہر نہ دیکھا اور نہ نامحرموں نے کبھی آواز سنی تھی، صرف مکتب اسلام اور انقلاب حسینؑ کی پاسداری کی خاطر، کوفہ وشام اور حتی دربار شام میں علیؑ کے لب ولہجہ میں ایمان افروز خطبے بیان کیے اور اسلام کے وجود کو تازہ روح بخشی۔

اگر عظیم باکردار ماؤں کی تربیت نہ ہوتی تو ان مصائب کا برداشت کرنا ناقابل تصور تھا۔ یہ محسنہ دین، جناب خدیجہ علیہا سلام کا دامن تھا، یہ مظلومہ تاریخ، جناب فاطمہ زہرا علیہا سلام کا پاکیزہ آغوش تھا جن سے حسنین علیہما السلام اور زینبین علیہما السلام جیسے گوہر وجود میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے کے محی الدین والاسلام امام خمینیؒ، جس نے اپنے انقلاب کو انقلاب کربلای حسینیؑ سے متصل کر کے مسلمانوں کو ایک نیا جوش اور ولولہ عطاء کیا، اپنے ایک نہایت اہم اور تاریخی کلام میں جناب فاطمہ زہرا علیہا سلام کی تعریف میں فرمایا ہیں:

''تمام کمالات جو کسی عورت یا انسان میں تصور کیے جاسکتے ہیں یکجا جناب فاطمہؑ کی شخصیت میں نمایاں تھے۔ حضرت زہراؑ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھیں۔۔۔ وہ ایک روحانی ہستی تھیں۔۔۔ایک ملکوتی ہستی۔۔۔صحیح معنوں میں انسان کامل۔۔۔مکمل انسانی نسخہ۔۔۔حقیقۃً ایک کامل خاتون۔۔۔حقیقتاً کامل انسان۔ ہرگز عام معمولی انسان نہیں تھیں؟ بلکہ ایک ملکوتی ہستی تھیں جو انسان کے روپ میں جلوہ افروز ہوئیں۔۔۔ایک الہی جبروتی ہستی جو عورت کے روپ میں ظاہر ہوئیں۔ان میں تمام انبیاء کے اوصاف موجود تھے۔۔۔ایسی خاتون، کہ جو اگر مرد ہوتیں تو نبی ہوتیں۔۔۔جو اگر مرد ہوتیں تو رسول اللہ کے مقام پر فائز ہوتیں''

کس قدر فاصلہ ہے ہماری پہچان میں۔۔۔ہماری معرفت میں۔۔۔ہماری سوچ میں۔۔۔اور کس قدر فقدان ہے ہمارے ایمان اور ہمارے عمل میں۔کیا ان ہستیوں کو ٹھیک سے پہچانے بغیر کوئی بھی عمل مکمل ہوسکتا ہے؟!!

تربیت کے موضوع میں سب سے زیادہ اہمیت ماں کے کردار کی ہے اور افسوس کی بات ہے اس موضوع میں سب سے زیادہ ظلم عورت پر ہوا ہے۔حتی ہمارے دینی گھرانوں میں بجائے اس کے کہ

دین کو سہی طریقے سے اور سہی ذرائع سے حاصل کرتے، افسوس کا مقام ہے کے اس موضوع پر بے جا تعصب کی وجہ سے شاید بالکل توجہ نہیں دی گئی۔ جس کے نتیجہ میں نسلوں کی نسلیں برباد ہو کر رہ گئیں۔ البتہ اس مقام پر کسی خاص فرد یا گروہ کو قصوروار ٹھہرانا منظور نہیں، بلکہ موضوع کی اہمیت اجاگر مقصود ہے۔ شاید آسان ترین راستہ یہ ہوگا کہ دیکھیں ایران کا انقلاب اس زمانے میں کیسے کامیاب ہوا؟ لبنان میں بار بار فتح کیسے نصیب ہوئی؟

پوری تاریخ میں کہیں کوئی ایسی فتح دکھائی نہیں دیتی جس میں خواتین کے مضبوط ارادوں کے بغیر مردوں کو کچھ حاصل ہوا ہو۔ اسلام کے آغاز کی سختیوں میں ام عمارؓ کی دلیرانہ شجاعت نظر آتی ہے، ہجرت حبشہ میں جناب ام حبیبہ نظر آتی ہیں، شعب ابیطالبؑ میں جناب خدیجہؑ نمایاں دیکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح جناب فاطمہ زہراؑ جنگ بدر کے معرکے سے لے کر، احد کے میدان میں، خندق کے حصار میں، ہر جگہ مردوں کے شانہ بشانہ کہیں زخمیوں می تیمارداری، کہیں مردوں کو رجز خوانی کے ساتھ حوصلہ اور وقت آنے پر ہاتھوں میں ہتھیار لے کر رسول اللہؐ کی جان کی حفاظت کرتی نظر آتی ہیں۔ اور کبھی امامت کے دفاع میں گھر سے باہر نکل آتا ہیں، اگر امیر المومنینؑ کو زبردستی مسجد لیجانے آتے ہیں تو بی بی نہ صرف مخالفت کرتی ہیں بلکہ عملی طور پر دشمن سے اظہار دشمنی فرماتی ہیں اور آخر حیات تک مدینے والوں سے ناراض رہ کر اپنی استقامت اور مخالفت کا اظہار فرماتی ہیں۔

اسی طرح کربلا میں جناب زینب علیھا سلام نے قافلہ سالار بن کر دنیا کی خواتین کو ایک بار پھر اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ البتہ انصاف تو یہ ہے کہ کوئی سوچ اور قلم اس شجاعت و استقامت کو بیان نہیں کرسکتی جو امیر اللمومنین کی صاحبزادی جناب زینبؑ نے حادثہِ کربلا میں دیکھائی۔ کہ اگر وہ مصائب پہاڑ پر گرتے تو انہیں پاش پاش کر دیتے، اگر زمین پر برستے تو اسے ویران کر دیتے اور اگر دریاؤں پر جاری ہوتے تو شدت گرما سے انہیں خشک کر دیتے۔ لیکن قافلہ سالار جناب زینب کبریٰؑ شجاعت اور استقامت کے ساتھ اپنے مقصد پر ثابت قدم رہیں۔ اگرچہ مشیت الہی میں مومنین اور صالحین کو آزمائیشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ جناب ابراہیمؑ خلیل اللہ، اپنے زمانے کے نمرود سے

بے شمار بحث وجدل کے بعد آتش نمرود سے آزمائے گئے، جسے خدا نے آپ کے لیے گلستان بنا دیا۔ پھر جناب ابراہیمؑ، ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ سے جدائی کے ذریعے آزمائے گئے اور ایک دن اپنے تنہا فرزند اسمعیلؑ کو ذبح کرنے کے حکم سے آزمائے گئے۔ اور جب جناب ابراہیمؑ تمام آزمائیشوں پر پورا اترے تو خدا نے انہیں مقام امامت عطا فرمایا۔

پھر انبیاءؑ میں سے جناب ایوبؑ نہایت دشوار آزمائیشوں سے آزمائے گئے، انہوں نے تمام پر صبر کیا اور یوں صبر ایوبؑ زباں زدِ خاص و عام ہوگیا۔ خود جناب سید الشّھداء امام حسینؑ نے بھی صبح عاشور سے ظہر تک شدید آلام ومصائب برداشت کئے اور اسی روز ظہر سے لے کر عصر عاشور تک اپنے جگر گوشوں اور معزز اصحاب رسول ﷺ کو اپنی ہی نگاہوں کے سامنے قربان ہوتے دیکھا، اور آخر میں ذبح عظیم کی تفسیر اپنے خون مبارک سے فرمائی۔ لیکن امام حسینؑ نے دین کی حفاظت اور پیغام کربلا کو بہتر طریقے سے ہر جگہ پہنچانے کی خاطر اپنی خواتین اور بچیوں کو ساتھ لا کر حادثہ عاشورہ کو مزید دلخراش بنا دیا۔ جب امام حسینؑ سے پوچھا گیا؛ ''آپ اپنے ساتھ میں عورتوں اور بچوں کو کیوں لے کر جا رہے ہیں؟'' آپؑ نے فرمایا: ان کو میرے ساتھ ضرور جانا ہے۔'' درحقیقت جناب سیّد الشّھداء نے ایسے شجاع اور با استقامت مبلغین کو انتخاب کیا تھا کہ جو آپؑ کی شھادت کے بعد دشمن کے قلب یعنی شام و کوفہ پر ضرب کاری لگا سکیں۔ درحقیقت یہ امام حسینؑ کی ایک نہایت ہی گہری اور عمیق جنگی حکمت عملی تھی۔

امام حسینؑ کی اسی نہج کو مدنظر رکھتے ہوئے بانی انقلاب اسلامی امام خمینیؒ نے فرمایا: ''۱۵ خرداد ۱۳۴۲ (۱۹۶۳) کی تحریک کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ اس میں خواتین کا کوئی کردار نہیں تھا۔'' اور ۲۲ بہمن ۱۳۵۷ (۱۹۷۸) میں انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی سے متعلق متعدد بار فرمایا: ''انقلاب کی کامیابی میں ہماری خواتین کا بنیادی کردار تھا، اگر مردوں سے آگے نہ ہوں، تو ہرگز اُن سے پیچھے بھی نہیں تھیں۔''

یہ حکمت عملی امام خمینیؒ نے اپنے سرور وسالار امام حسینؑ سے سیکھی تھی اور آپ معتقد تھے کہ

مسلمانوں کی فتح وکامیابی کا راز عاشورہ کواس کے تمام زوایا کے ساتھ زندہ رکھنے میں ہے۔

انقلاب حسینیؑ اور حماسہ عاشورہ میں جس شخصیت نے سب سے بیشتر امام حسینؑ سے نورانیت حاصل کی اور بہترین درس حاصل کیا وہ جناب سیدہ زینب سلام اللہ علیہا تھیں۔ جیسا کہ فارسی زبان میں ایک مشہور شعر ہے:

ترویج دین اگرچہ بہ قتل حسینؑ شد تکمیل آن بہ موی پریشان زینبؑ است

یعنی اگرچہ دین کی ترویج امام حسینؑ کے خون سے ہوئی لیکن اس کی تکمیل بی بی زینبؑ کے پردہ چھننے نے کی۔

حقیقتاً عجیب ماجرا ہے، زینبؑ جو دامن علیؑ وزہراؑ میں پروان چڑی ہیں، جنہوں نے کبھی دن میں مدینے کے گلی کوچوں کو نہ دیکھا تھا، کس قدر مظلومیت ہے کہ وہ اب کربلا میں کیا کیا کچھ سہیں گی۔ البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جناب زینبؑ کی شخصیت نے کربلا کے بعد مزید عظمت اور وقار حاسل کرلیا۔ یعنی کربلا سے پہلے والی زینبؑ اور بعد والی زینبؑ میں فرق ہے۔ کربلا میں ہم دیکھتے ہیں کے بی بی زینبؑ ایک دو بار پریشان اور مضطرب ہوئیں اور رونے پر قابو نہ پاسکیں۔ یہاں تک ایک مرتبہ اس قدر روئیں کے دامن حسینؑ میں غش کھا گئیں لیکن حسینؑ نے آرام آرام بہن کو دلاسہ دیا۔ زینب! دامن صبر کو ہاتھ سے مت جانے دو! وسوسوں کو نزدیک نہ آنے دو! کیا تمہیں یاد نہیں میرے ناناؐ مجھ سے بہتر تھے وہ بھی اس دنیا سے چل بسے! میرے باباؑ، میرے بھائیؑ اور میری مادرؑ اسی طرح۔ اس وقت جناب زینبؑ نے فرمایا: ''بھائی حسینؑ: جب وہ سب گئے تو میری کوئی سر پناہ تھی لیکن آپ کے بعد میرا کون ہے؟''

لیکن جوں ہی عاشور کے دن ڈھلتا ہے جناب زینبؑ کی شخصیت تبدیل ہوگئی اور حسینؑ کا وقار اور عظمت آپ میں دیکھائی دینے لگی۔ یہ چیز ہمیں ایران میں دیکھائی دیتی ہے کہ جہاں صدّام کے خلاف جنگ میں مائیں اپنے بچوں کو جنگ کے لیے روانہ کرتی ہیں اور فطرتاً بعض مائیں پریشان بھی ہوتی تھیں لیکن جب ان کی شہادت کی خبر موصول ہوتی اور ساتھ میں شہید کی وصیت ملتی کہ ''میرے

جنازے پر گریہ نہ کرنا بلکہ اگر کبھی رونا چاہیں تو حسینؑ کی مظلومیت پر رو لینا یا اگر میری جوانی کی یاد آئی تو حسینؑ کے علی اکبرؑ کو رو لینا! کبھی امام خمینیؒ کو تنہا نہ چھوڑنا اور ہمیشہ اپنا جان مال ان کے لیے قربان کرنا۔ کیونکہ وہ نائب امام زمانؑ ہیں۔''

یہ سُن کر مائیں اپنے ہاتھ آسمان کی جانب بلند کرتیں اور دعا کرتیں ''خدا ہماری قربانی قبول فرما''۔ پھر خود بھی کوشاں نظر آتیں کہ اپنے ہاتھوں سے مجاہدین کے لیے مختلف اشیاء خورد و نوش کی جمع آوری اور ارسال میں مدد کرتیں۔ گویا اپنے فرزندوں کے گرے ہوئے پرچم اپنے ہاتھوں سے بلند کرتیں۔ یہ رشادت یہ شجاعت مکتب حسینؑ کی ہے جو ان ماؤں نے جناب زینبؑ سے پائی ہے۔ یعنی اگر مردوں نے حسینیؑ کام کیا تو عورتوں نے زینبیؑ کام کر دیکھایا۔ بلکہ گھروں میں خواتین مشعل بردار انقلاب تھیں، یعنی خواتین کے ذریعے انقلاب گھروں کے اندر داخل ہوا۔ عرض ہوا کہ جناب زینبؑ واقعہ کربلا کے بعد تبدیل ہوگئیں، اب آپ کے آگے کسی مستکبر کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

جناب امام سجادؑ فرماتے ہیں؛ ''ہم بارہ افراد تھے جنہیں ایک ہی زنجیر سے باندھا ہوا تھا۔ زنجیر کا ایک سرا میرے بازو میں اور دوسرا سرا میرے پھوپی زینبؑ کے بازو میں تھا۔'' کہتے ہیں کے اسراء دوم صفر کو دمشق میں داخل ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ شام میں داخلے کے وقت جناب زینبؑ کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ۲۲ دن بیت چکے تھے۔ ۲۲ دن اسارت کی سختیاں برداشت کیں؛ اور اس حال میں انہیں یزید بن معاویہ کے دربار میں حاضر کیا گیا؛ وہ دربار جسے معاویہ نے تعمیر کروایا تھا جو قلعہ اَخْضَر یعنی سبز کے نام سے مشہور تھا؛ اور جس کا شکوہ و دبدبہ اور جس کی رعنائیاں ہر دیکھنے والے کو مسحور کر دیتی تھیں۔

اس حال میں اسراء کو لایا گیا، جناب زینبؑ کبریٰ رنجور اور ماتم زدہ جب اس محفل میں داخل ہوئیں تو آپ کے رعب و وقار سے محفل پر ایک عجیب دہشت چھا گئی یہاں تک کہ یزید جس کی فصاحت و بلاغت مشہور تھی، گونگا ہوگیا۔ پھر اس محفل میں بنت علیؑ نے ایسا فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا کہ یزید پر موت کا سکتہ تاری ہوگیا۔ یزید اس بے آبروئی سے بچنے کے لیے احمقانہ کوششیں کرتا رہے لیکن جناب

زینب کبری علیھا سلام اسی طرح مضبوط اور مستحکم ارادے کے ساتھ مقاوم کھڑی رہیں۔امام خمینیؒ اپنے ایک خطاب میں شہر قم مقدسہ کی خواتین سے فرماتے ہیں:

''آپ خواتین نے ثابت کر دیکھایا ہے کہ آپ پیش قدم ہیں۔آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ مردوں سے آگے پیش پیش ہیں۔مرد حضرات آپ سے الہام حاصل کرتے ہیں۔ایرانی مردوں نے خواتین سے تعلیم پائی،خواتین سے سیکھا ہے،اور قم کے مرد حضرات نے آپ سے عبرت حاصل کی اور تعلیم پاتے ہیں،آپ خواتین اس تحریک میں پیشا پیش ہیں۔۔۔''

آگے فرماتے ہیں؛''میں آپ تمام کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس قیام میں شرکت فرمائی، اور اُن تمام ماؤں کا جنہوں نے اس راہ میں اپنے فرزند قربان کیے،اور اس ماں کا جس نے ایک شہید دینے کے بعد کہا کہ میں اپنے دوسرے بیٹے کو بھی قربان کروں گی۔'' یہ افکار یہ سیرت و کردار سارے کا سارا کربلائی و عاشورائی ہے۔تاریخ بنانے میں مردوں کا کردار ہے یا عورتوں کا،اس سے متعلق تین قسم کے نظریات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ تاریخ میں بنیادی کردار صرف مرد کا ہے اور خواتین کا کوئی کردار نہیں۔

۲۔مرد و عورت دونوں کا ملا ہوا کردار ہے یعنی کبھی مرد عورت کی جگہ لے لیتا ہے اور عورت مرد کی جگہ۔ جیسا کہ بعض اوقات مرد عورتوں کی ذمہ داریاں سنبھال لیتا ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مرد بچے سنبھالتا ہے اور عورت کاروبار کرتی ہے۔ درحقیقت مرد و عورت ایک دوسرے کے دایرہ اختیارات میں داخل ہو جاتے ہیں۔

۳۔مرد و عورت تاریخ کی تشکیل میں دونوں برابر اہمیت رکھتیں ہیں لیکن مرد اپنے حدود و اختیارات میں اور عورت اپنے حدود و اختیارات کے اندر۔ جب ہم قرآن کریم میں تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں دین و مذہب میں مرد و عورت دونوں کا تذکرہ ملتا ہے۔جیسا کہ شہید مرتضی مطہری فرماتے ہیں تاریخ مذنّث یعنی مذکر و مونث دونوں کے بشمول لیکن نہ ایک دوسرے کہ ساتھ مل جل کر بلکہ ہر کوئی اپنی حدود میں جدا جدا۔تاریخ کربلا درحقیقت ایک مذکر و مونث تاریخ و حادثہ ہے،ایسی تاریخ جس میں مرد و عورت دونوں

کی نقش آفرینی ہے، اور دونوں نے صبر وشجاعت کے ساتھ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے قیام کیا ہے۔اسی لیے حضرت اباعبداللہ الحسینؑ نے اپنے اہل بیتؑ کو اپنے ہمراہ لیا ہے کیونکہ ان کی بھی تاریخ میں عظیم ذمہ داری ہے، انہوں نے بلا واسطہ تاریخ کی تشکیل میں اپنا کردار اداء کرنا ہے۔انہوں نے جناب زینب کبریٰ علیھا سلام کی سپہ سالاری میں اپنی حدود سے خارج ہوئے بغیر نقش آفرینی کرنی ہے۔

ایرانی خواتین نے بھی کربلا کی خواتین کی تقلید و پیروی میں دوران انقلاب اور صدام کی آغاز کردہ جنگ میں بھی خود اپنے مردوں اور جوانوں کو میدان کارزار کے لیے آمادہ کیا اور بعد شھادت بھی صبر کا جام نوش کر کے قافلہ سالار شام کی طرح شھداء کے مشن اور مقاصد کے پرچار کی خاطر سرگرم عمل ہوگئیں۔اس مقام پر امام خمینیؒ کا قول یاد آتا ہے کہ آپ فرماتے ہیں؛

''ہمیں جتنی بھی کامیابیاں نصیب ہوئیں ہیں اس کے لیے ہم مردوں کی نسبت خواتین کے زیادہ مرہون منت ہیں۔ہماری خواتین ہمیشہ اگلی صفوں میں پیش پیش رہی ہیں۔ہماری خواتین مردوں میں جرات وشجاعت کا سبب بنیں۔ہم آپ خواتین کی زحمتوں کے مرہون منت ہیں اور ہمیشہ آپ کے لیے اور پوری ملّت کی سربلندی کے لیے دعا گو ہیں۔'' جیسا کہ قبلاً ذکر ہوا ہے کہ کربلا میں مرد وعورت ہر کسی نے اپنے حدود واختیارات کے دائرے میں ذمہ داری انجام دے رہا تھا اور جناب زینب کبریٰ علیھا سلام نے عصر عاشورہ سے تجلّی فرمائی۔

درحقیقت کہا جاسکتا ہے کہ حضرت اباعبداللہ الحسین علیہ السلام کا قیام دو حصوں میں انجام پذیر ہوا ہے؛ پہلا حصہ امام حسینؑ کی شہادت کے ساتھ ختم ہوا اور دوسرا حصّہ ، جو دراصل پہلے حصّے کا ہی تسلسل تھا، صبر واستقامت کی بے مثل مثال ثانی زہراؑ جناب زینب کبریٰ علیھا سلام کی قافلہ سالاری کے ساتھ آغاز ہوا۔وہ قافلہ، جو کربلا کو فتح کرنے کے بعد اب صرف چند عورتوں، بچوں اور ایک بیمار مرد پر مشتمل تھا۔سب کے سب اپنا کوئی نہ کوئی عزیز قربانگاہ الٰہی میں فدیہ دے کر آئے تھے۔اور ان سب کے درمیان جناب زینبؑ کا غم سب سے بیشتر تھا۔

تمام شہیدوں کا غم دل میں سمیٹتے ہوئے،

دوسروں کو حوصلہ دیتے ہوئے،

بیمار کربلا کی تیمارداری کرتے ہوئے،

منصب امامت کی حفاظت کرتے ہوئے،

بیواؤں کو ہمت دیتے ہوئے،

معصوم یتیموں کے آنسو پونچھتے ہوئے،

اور امام حسینؑ اور شہداء کربلا کی قربانیوں کے مقاصد کو زندہ کرتے ہوئے،

وقار مصطفویؐ، شجاعت حیدریؑ اور غیرت زہرائیؑ کے ساتھ؛

جناب زینبؑ کبریٰ قافلہ لے کر شام کو فتح کرنے چلیں۔

اس قافلے میں تنہا مرد سید الساجدین امام زین العبدینؑ تھے، جو روز عاشورہ سے بامر الٰہی بستر بیماری پر تھے۔ حاکم کوفہ ابن زیاد کا حکم تھا کہ کسی مرد کو زندہ باقی نہ رہنے دیا جائے، چند مرتبہ دشمنان خدا نے امامؑ کو قتل کرنا چاہا، لیکن جناب زینب کبریٰ کی شجاعانہ اور دلیرانہ استقامت کے آگے بے بس ہوگئے۔ جناب زینب کبریٰ علیہا سلام نے دوران سفر امام زین العابدینؑ کی تیمارداری کر کے در حقیقت نسل امامت کی حفاظت فرمائی۔ یہ شجاعت اور دلیری درحقیقت جناب علیؑ و زہراؑ علیہم السلام کی تربیت و تعلیم کا ثمرہ تھا۔

سب سے پہلی مجلس عزا جناب سیدہ زینب کبریٰ علیہا سلام نے گیارہ محرم الحرام کو مقتل و معراج شہداء کربلا میں برپا کی۔ اسراء و ناموس اہلبیتؑ کو بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کیا گیا؛ جناب زینب کبریٰ نے تمام یتیموں اور بیواؤں کو سوار کیا؛ امام صبر و استقامت امام زین العابدینؑ کو سوار کیا، بیماری کی وجہ سے امام کے پیر اونٹ کے شکم سے باندھ دیے گئے۔ قافلہ لُٹے ہوئے، جلے ہوئے خیام حسینیؑ سے چلا۔ جیسے ہی مقتل سید الشّھداءؑ کے قریب پہنچا تمام اسراء نے محملوں کو رہا کر کے خود کو خاک کربلا پر گرا دیا۔ سب سید الشّھداء کے بدن اطہر کے گرد جمع ہوئے۔ نواسہ رسول، دلبند بتول کو ایسی حالت

میں دیکھا جو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ امام عاشقاںؑ کا برہنہ، سر بریدہ زخموں سے چور بدن جسے شکستہ تیروں، نیزوں اور پتھروں نے ڈھانپا ہوا تھا۔ جناب زینب کبریٰؑ نے خود کو بھائی کے بدن پر گرا دیا۔ اس قدر شدید آہ و نالہ کیا "فَابْکت کُلّ عَدُوٍ وَ صَدیقٍ" کہ جس سے ہر دوست و دشمن رونے لگ پڑا۔ اور عصر عاشورا شہادت حسین بن علیؑ کے بعد جناب زینب کبریٰؑ نے فرمایا؛" ربّنا تقبّل مِنّا هذا القلیل" ہمارے پالنے والے ہم سے یہ بہت تھوڑا قبول فرما۔''

امام خمینیؒ نے کربلا کے حقائق کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے، مجالس نوحہ و ماتم کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مجالس کے گہرے اور عمیق اثرات سے اکثر لوگ ناواقف ہیں اور بعض تو اسے بے اہمیت سمجھتے ہیں۔ یہ جو ہماری احادیث میں ایک قطرہ اشک بہانے اور تباکیٰ (یعنی رونے کی صورت بنانے) کی اس قدر اہمیت اور ثواب بیان ہوا ہے اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ امام حسینؑ اپنے شیعوں کے اشک و نالہ و ماتم کے منتظر ہوں، بلکہ اس ثواب کے بیان کا اصل مقصد انقلاب عاشورا کو زندہ رکھنا ہے۔'' ایک اور جگہ پر امام خمینیؒ تاریخ انقلاب اسلامی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، ''پہلی مرتبہ جب حکومت شاہ کے کارندوں نے مجھے قم سے گرفتار کر کے گاڑی میں لے جا رہے تھے تو انہوں نے کہا'' کہ ہم آتے ہوئے ان کالی چادروں سے (انقلابی خواتین جو شاہ ایران کے خلاف مظاہروں میں شرکت کرتی تھیں) خوفزدہ تھے کہ کہیں انہیں خبر نہ ہو جائے اور یہ ہمارے کام میں رکاوٹ بن جائیں۔'' یہ لوگ تو کیا، تمام بڑی قوتیں ان سے ڈرتی ہیں، یہ خواتین جن کی کوئی سربراہی کرنے والا نہیں؛ یہ اپنے ذاتی جذبے کے ساتھ پوری ملت کو آپس میں متحد کرتی ہیں۔ سید مظلومان کی انہی مجالس عزا و سوگواری اور نوحہ خوانی اور ذکر مظلومیت امام حسینؑ کے جنہوں نے خدا اور اس کی رضا کی خاطر اپنی جان اور اولاد و اصحاب کو فدا کر دیا، نے ایسے جوان پیدا کئے جو جنگ (ایران پر صدام کی مسلط کردہ آٹھ سالہ جنگ) میں شرکت اور شہادت کی آرزو رکھتے ہیں اور شہادت پر افتخار کرتے ہیں۔ اور ماؤں کو صبر اور جرات سے ایسا دلیر بنا دیا کہ جب ان کا فرزند شہید ہوتا تو کہتیں؛ ہمارے پاس جنگ میں بھیجنے کے لیے مزید ایک دو فرزند اور موجود ہیں۔''

امام خمینیؒ کے الفاظ اس قدر لوگوں کی جانوں میں اثر گزار ہوتے ہیں کے جب جنگ کے دس بارہ سال بعد شہداء کی صرف چند ہڈیاں اور گلے میں نمبر والی زنجیر اُن عظیم ماؤں کو دی جاتی تو جناب زینب کبریٰؑ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ بھی کہہ دیتیں کہ، اے خدا! ہم نے تیرے مقرب بندے کی پکار پر لبیک کہا۔ یہ معاملہ ہم نے تیرے ساتھ کیا اور جو تیری راہ میں دے دیا اس کی بازگشت کی بھی ہمیں تمنا نہیں ہے۔ یہاں پر میں ایران کے ایک شہر اراک میں بسنے والے شہید کے ایک خاندان کا واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔ اس گھر میں ماں نے تین بیٹے، ایک بھائی اور چند بھانجے دوران جنگ اسلام کو ہدیہ کیے ہیں، اور دو بیٹے جنگ میں معذور ہو گئے ہیں۔ ایرانی سال کے آغاز سے ایک روز پہلے جسے نوروز کہتے ہیں، شہر اراک میں سیکڑوں شہید لائے گئے جن میں اس گھر کے دو شہید بھی شامل تھے۔ تمام شہداء سے وداع کے لیے ایک محفل کا انتظام کیا گیا جہاں پر شہداء کے جنازوں کے علاوہ ان کے ورثاء بھی موجود تھے۔ ان دو شہیدوں کی ماں،

دوسرے شہیدوں کے ورثاء کی مانند، نہایت قوی روح اور مضبوط ارادے کے ساتھ کھڑی ہو کر ہزاروں آنے والوں کی تعزیت قبول کرتی رہیں اور غفلت زدہ کو درس استقامت کا ایک بے مثال درس دیتی رہیں۔ کبھی کبار آنے والوں سے کہتیں میرے بیٹے علی اکبرؑ اور قاسمؑ سے زیادہ عزیز تو نہیں۔ یہاں تک کہ امام خمینیؒ کی وفات ہو گئی۔ جب لوگ انہیں ملنے گئے تو انہوں نے کہا کہ امام خمینیؒ کی وفات نا قابل تحمل ہے، اور ساتھ ہی ان کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں۔ وہ کہتیں، ''میرا دل چاہتا ہے جتنا جلدی ہو سکے میں امام خمینیؒ کے گھر والوں سے جا کر ملاقات کروں اور انہیں بتاؤں کے ہم ان کے ساتھ ہیں جیسے امام خمینیؒ ہمیشہ ہمارے ساتھ تھے۔''

ایران کے لوگوں پر امام خمینیؒ کا اتنا گہرہ اثر صرف عاشورا میں قیام حسینیؑ اور صبر زینبیؑ کا واضح نمونہ ہے۔ امام خمینیؒ نے کس قدر فصیح و بلیغ کربلا کی تفسیر کی اور لوگوں نے کس قدر خوبصورتی سے آپ کے فرمان پر جان نچھاور کی۔

ایک اور مقام پر امام خمینیؒ جمعہ اور جماعات کے پیش نماز حضرات سے خطاب کرتے ہوئے

فرماتے ہیں ''جس قدر میں آگاہ ہوں اس سے بڑھ کر صحیح طریقے سے مسئلہ عاشورا کو لوگوں کے لیے واضح کریں۔ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کے ہم رونے والی قوم ہیں۔ ہم وہ ملت ہیں جس نے دو ہزار پانچ سو سالہ جابر حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔''

ان تمام چیزوں کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ عاشورا کا اصل مقصد سمجھ میں آجائے اور وہ ہر ظلم کے مقابلے میں آواز، ہر برائی کا خاتمہ، مظلوم کی فریادرسی اور ظلم وظالم کا قلع قمع ہے۔ چاہے اس راہ میں جان، مال، عزت، آبرو اور حتی ناموس ہی کیوں نہ فدا کرنی پڑھ جائے۔ اسی طرح ایک اور درس خواتین کا کردار ہے کہ جس کی بہترین مثال ہمیں کربلا میں ملتی ہے۔ آج اس کی مثال ایران کے انقلاب اور لبنان کے مُٹھی بھر شیعوں میں دیکھائی دیتی ہے۔ جنہوں نے مکتب عاشورا سے صحیح درس حاصل کر کے پرچم پر افتخار حسینیؑ کو ایک مرتبہ پھر برافراشتہ کر دیکھایا۔ اور سوتی ہوئی انسانیت کو ماننے پر مجبور کر دیا کہ جیت صرف حق والوں کی ہوتی ہے ولو وہ تعداد میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک اور چیز جو ان مثالوں میں بہت خوبصورتی سے دیکھائی دیتی ہے وہ اطاعت ولی ہے۔ جس طرح کربلا میں سب امامؑ کی اجازت سے انجام پاتا اسی لیے کوئی بغیر اذن کے مقتل و جنگ کو نہ گیا۔ اسی طرح امام خمینیؒ کے زمانے میں بھی ایرانی ملت نے اطاعت کی۔ لبنان میں بھی یہی دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ چیز جو فتح کی باعث بنی اطاعت رہبر اور وحدت تھی۔ سید حسن نصر اللہ، حزب اللہ کے جنرل سیکٹری نے اسرائیل کی ذلت بار شکست کے بعد ایک انٹرویو میں کہا کہ یہ فتح ہمیں رہبر مسلمین جہاں حضرت آیت اللہ سید علی خامنہ ای کی اطاعت وفرمانبرداری سے حاصل ہوئی ہے۔

جیسا کہ عرض ہوا جناب زینب کبریٰ علیہا سلام نے سب سے پہلی عزاداری گیارہویں کہ روز کربلا میں برپا کی اور شجاعت واستقامت کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں بھی انجام دیتی رہیں؛ بیمار کربلا سید السّاجدین ؑ کی تیمارداری کے فرائض بھی انجام دیتی رہیں؛ ایک وقت دیکھا کہ امام زین العابدینؑ بالکل نڈھال ہوگئے اور بدن جان دینے کو ہے، فوراً آپ نے بھائی کے بدن مبارک کو چھوڑا اور خاص تدبیر کے ساتھ امام زین العابدینؑ کو تسلّی دی اور ان دشوار گھڑیوں میں یہ حدیث بیان کی کہ ''یہ شہادت با مقصد

تھی! ہرگز ایسا نہ سمجھ لینا کہ بس حسینؑ شہید ہوگئے اور ختم ہوگئے۔ میں نے اپنے جدامجدؐ سے یہ حدیث سنی ہے کے انہوں نے فرمایا کہ حسینؑ اسی جگہ پر جہاں ان کا جسد مبارک دیکھ رہے ہو، بغیر کفن کے دفن کئے جائیں گے اور یہیں پر ان کی قبر لوگوں کی زیارت گاہ بنے گی۔''

درواقع آئندہ کی خبر دے کر جناب زینب کبریٰؑ نے امام زین العبدینؑ کو حوصلہ بھی دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہم اپنے کردار سے ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں جس میں فتح ہماری ہوگی اور یہی مظلوم امامؑ جو ابھی بے غسل و کفن کھلے آسمان تلے، اپنے مخلص اصحاب کے ساتھ یاں آرمیدہ ہیں، ایک دن صاحب گنبد و بارگاہ ہونگے اور زوّار دور و نزدیک سے تشرف حاصل کرنے کے لیے یہاں حاضر ہونگے۔

اسی طرح جب بارہ محرم کو قافلہ دروازہ کوفہ پر پہنچا تو اس قدر شور وغوغا تھا اور اکثر لوگ معرفت نہ رکھنے کی وجہ سے تالیاں بجا رہے تھے اور اظہار خوشی کر رہے تھے کہ اگر اس وقت ڈھول بجایا جاتا تو اس کی آواز بھی کسی کو سنائی نہ دیتی؛ لیکن اس وقت جناب سیدہؑ، جو نویں کی رات سے مسلسل بیدار تھیں اور ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوسکیں، اس قدر باوقار اور شہامت وشجاعت کے ساتھ شہر میں داخل ہوئیں کہ آپ کے ایک اشارے پر لوگوں کی سانس سینوں میں محبوس ہوگئی، بچوں کے رونے کی آواز اور یہاں تک کے ارباب تاریخ نے لکھا ہے کہ جانوروں کی گردن میں بندھی گھنٹیوں کی آواز بھی بند ہوگئی۔ مجمع پر ایک سکتا تاری ہوگیا۔ پھر جناب ثانی زہراؑ نے خطاب فرمایا۔

کربلا بہت ہی عظیم سانحہ تھا لیکن جو خدا کو عظیم جانتا ہے اس کے لیے ہر شئے معمولی رہ جاتی ہے۔

پھر جب حکومت بنی امیہ نے پوچھا کہ اس سب کو کیسا دیکھا؟ جناب زینب کبریٰؑ نے فرمایا؛ " **ما رایتُ الاّ الجمیلاً**" مجھے خوبصورتی کے سوا کچھ دیکھائی نہیں دیتا''۔ عارف کی نگاہ میں خدا کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے ہر ارادے میں انسان کی تربیت دیکھائی دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ عارف ہمیشہ اس کے سب امور کو خوبصورت دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اس میں رب کی رضا تھی۔

راوی کہتا ہے کہ جب جناب زینب کبریٰؑ خطبہ دیتیں تو آپکے کلام میں شجاعت حیدریؑ اور

عصمت زہرائی واضح دیکھائی دیتی گویا کہ علیؑ کے لہجے میں فاطمہؑ خطاب فرمارہی ہیں۔ یہ اسی تربیت کا اثر تھا جو آپکو جناب رسولؐ کے گھرانے سے نصیب ہوئی، یہ اس ماں کی گود کا اثر تھا جس نے کسی کے کہے بغیر سب کچھ خود کر دیکھا۔ یہ اس باپ کی حلال روزی کا اثر ہے جس نے زندگی کے مقیاس کو ہمیشہ صداقت، عدالت اور شجاعت کے ترازو میں رکھا؛ اسی لیے نہ کسی پر ظلم کیا اور نہ غیر خدا سے کوئی توقع رکھی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو پیام زینبؑ میں آج بھی سنائی دے رہی ہیں اور تا قیامت سنائی دیتی رہیں گی۔ آج بھی اگر معاشرے میں عورت کا وقار بحال ہوجائے تو گذشتہ بہاریں پھر سے لوٹ آئیں گی۔ اور جب جناب زینب کبریٰؑ کا نہایت مختصر خطبہ تمام ہوا تو سب انگشت بدندان حیران و پریشان کھڑے دیکھتے رہے۔ ان کی فتح کی خوشیاں عزا میں تبدیل ہوگئیں۔

یہی وجہ ہے کہ ارباب تاریخ کربلا میں کوفیوں کی خیرہ سری کی ایک وجہ ان کی خواتین کا اجتماعی امور سے مطلع نہ رہنا، حالات سے بے خبری اور مسلمانوں کے امور میں دلچسپی نہ لینا بیان کیا ہے۔ اکثریت کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کوفہ کا گورنر کون ہے؟ یزید کون ہے؟ کس قسم کا انسان ہے؟ ان خواتین کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جناب مسلم بن عقیلؑ کتنے دنوں سے کوفہ میں مقیم ہیں اور ان کے مردوں سے بیعت جمع کر رہے ہیں۔ ان کی عورتوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حسینؑ اس وقت کہاں ہیں اور کن کی دعوت پر اپنی آل واولاد اور اصحاب کے ساتھ حج بیت اللہ الحرام کو عمرہ مفردہ میں بدل کر کوفیوں کے مہمان بننے آرہے ہیں۔ البتہ بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ خواتین کو مختصر واقعات کی اطلاع تھی، لیکن یا اس وقت بہت دیر ہوچکی تھی یا وہ بھی دشمن کی سازشوں اور فریب کارانہ ہتھکنڈوں میں پھنس گئیں تھیں۔

کربلا ایک ایسا منظر ہے جس میں ہر قسم کی قربانی نظر آتی ہے گویا خدا نے مقدر فرمادیا ہے کہ اس میں مرد کا کردار ہو، عورت کا کردار ہو، پیر و جوان کا کردار، سیاہ و سفید کا کردار، عرب و عجم کا کردار ہو۔ یہ جو مشہور ہے کہ کربلا میں بنیادی کردار خاتون کا تھا اس کا مطلب ہے تمام خواتین کا، جبکہ سب سے زیادہ کلیدی کردار اور سپہ سالاری کے فرائض جناب زینب کبریٰؑ کا تھا کے جن کی سب سے زیادہ قربانی

تھی۔عبداللہ بن عمیر کلبی کی زوجہ کربلا میں شہید ہوگئیں۔کربلا میں تین افراد اپنے گھر والوں کے ساتھ میدان کارزار میں تشریف لائے؛ مسلم بن عوسجہ، عبداللہ بن عمیر کلبی اور تیسرے جنادۃ بن حرث الانصاری۔

جناب عبداللہ بن عمیر کے بارے میں ارباب تاریخ لکھتے ہیں کہ آپ کوفہ سے باہر تھے کہ آپ کو اطلاع ملی کے کوفہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔آپ مجاہدین اسلام میں سے تھے۔آپ نے فیصلہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی آل کی حفاظت کریں گے۔آپ فوراً گھر پہنچے زوجہ سے مشورہ کیا، آپکی زوجہ نے آپکو تحسین کیا لیکن کہا کہ اس کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ مجھے بھی ساتھ لے کر چلو۔اپنی زوجہ کو لے کر چلنے لگے تو ماں بھی ساتھ چل پڑیں۔بہرحال عبداللہ بن عمیر میدان کارزار میں وارد ہوئے بہت سے سرکشوں کو واصل جہنم کیا لیکن کسی نے پشت سے حملہ کیا اور ایک ہاتھ جدا کر دیا، آپ نے دوسرے ہاتھ سے وار کر کے اسے ختم کر دیا۔

اسی حال میں رجز پڑھتے ہوئے سرور شہیدان کے پاس پہنچے، اپنی ماں سے عرض کیا، ''کیا میں نے خوب عمل کیا ہے، کیا تم مجھ سے راضی ہوگئیں؟'' ماں نے جواب دیا؛ ''نہیں! میں تم سے راضی نہیں ہوں۔میں جب تک تمہیں شہید ہوتا نہ دیکھ لوں تم سے راضی نہیں ہوں۔'' اس اثناء میں اس کی بیوی جو جوان تھی آ کر اس کے دامن سے لپٹ گئی۔ماں نے فوراً کہا؛ ''میرے بیٹے! کہیں احساسات تم پر غالب نہ آ جائیں۔یہ وقت بیوی کی باتیں سننے کا نہیں ہے۔اگر تم چاہتے ہو کے میں تم سے راضی ہو جاؤں تو ناچار تمہیں شہید ہونا پڑے گا۔'' عبداللہ بن عمیر ایک بار پھر میدان میں گیا اور اس بار شہید ہوگیا۔دشمن نے اس کا سر کاٹ کر اس کے خیمہ کے دروازہ پر پھینک دیا۔ماں نے جھک کر اسے اٹھایا، نوازش کیا، چوما اور کہنے لگی ''ہاں بیٹا! اب میں تجھ سے راضی ہوگئی''۔پھر اس نے سر کو دشمن کی طرف واپس پھینکتے ہوئے کہا ''ہم جو چیز خدا کی راہ میں دے دیتے ہیں اسے واپس نہیں لیتے''۔اور پھر خیمہ کا ایک ستون لے کر دشمن پر حملہ آور ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح دلیر ماں کا ایک اور واقعہ نقل ہے کے کربلا میں ایک جوان جس کا والد شہید ہوگیا تھا

امام حسینؑ سے اذن جہاد لینے آیا۔ امام نے فرمایا اس کو جانے نہ دیں، اس کا بابا شہید ہو چکا ہے بس یہی کافی ہے؛ اس کی ماں بھی یہیں پر حاضر ہے کیا معلوم وہ راضی نہ ہو۔ جوان فوراً بولا ''یا اباعبداللہ الحسینؑ، میری ماں نے ہی یہ شمشیر میری کمر میں باندھی ہے اور مجھے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ جاؤ تم بھی اپنے بابا کے راستے پے چلتے ہوئے اپنی جان امام حسینؑ پر قربان کر دو۔''

جانفشانی اور قربانی کی یہ مثالیں انسانیت و بشریت کے لیے مکتب حسینیؑ اور زینبیؑ کا تحفہ ہیں۔ آج دنیا میں جہاں کہیں بھی ایثار و قربانی کا ذکر ہوتا ہے وہاں خواہ نخواہ حسینؑ و زینبؑ کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر کربلا نہ ہوتا تو انسانیت ہرگز فلسفہ حیات جاوداں سے باخبر نہ ہوتی۔ کربلا نے انسانیت کو صرف جینے کا ڈھنگ نہیں بلکہ مرنے کا سلیقہ بھی سکھا دیا۔ یہ انہی ماؤں کا کردار ہے کہ جو مقصد حیات کو سمجھ گئیں اور با معرفت آغوش میں ایسی اولاد کی تربیت کی کے جسے اگر ابراہیمؑ قربانگاہ میں چلنے کو کہیں تو بجای علت وسبب پوچھنے کے اسماعیلؑ کی طرح باپ کو اس کے امتحان میں مدد کرتے ہیں اور جیسا خدا نے اپنے کلام میں فرمایا کہ جب ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ سے کہا کہ مجھے تیری قربانی کا حکم ملا ہے تو اس کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ تو جواب میں اسماعیلؑ نے فرمایا؛ " **یا ابتِ افْعَل ما تُئومَر سَتَجِدُنی انشاالله مِن الصّابرین**''، بابا جو آپ کو حکم ہوا ہے انجام دیجئے، انشاللہ آپ مجھ صابرین میں سے پائیں گے۔

امام خمینیؒ فرماتے ہیں؛ ''امام حسینؑ نے اپنی ذمہ داری سمجھی تا کہ اس قوت کے مقابلہ میں قیام کریں اور شہید ہو جائیں۔ تا کہ اپنی اور اصحاب کی قربانی سے حالات کو دگرگوں کریں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک جابر نے ان کی حکومت پر قبضہ کر لیا ہے، انہوں نے خدا کی جانب سے اپنی ذمہ داری سمجھی کہ اس کا مقابلہ کریں، ان کی مخالفت کریں، ان کا انکار کریں اور پھر جو ہوتا ہے ہو جائے۔ اور بخوبی واضح تھا کہ اتنی کم تعداد ان کا مقابلہ نہیں کر پائے گی لیکن ان کی شرعی ذمہ داری تھی۔ لیکن سید الشہداؑ کے لیے یہ شرعی ذمہ داری تھی کے قیام کریں، خون دیں اور اس حکومت کا تختہ الٹ دیں، یزیدی پرچم کو سرنگوں کر ڈالیں۔ اور ایسا ہی ہوا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے اپنا خون، بچوں کا

خون اور اولاد کا خون اور اپنا سب کچھ اسلام کی حفاظت اور بقاء کے لیے دے دیا۔''

کس قدر خوب درس دیا ہے سید الشّہداء امام حسینؑ نے اور کس قدر خوب امام خمینیؒ نے درس حاصل لیا ہے۔ اور صد آفرین ان ماؤں پر جنہوں نے اپنے پیشواؤں اور راہنماؤں کی ہدایت پر عمل کر کے ایک زندہ و بیدار قوم کی تربیت کی اور ایسے فرزند پروان چڑھے جنہیں دیکھ کر تاریخ کی مائیں رشک کرتی ہیں۔ ہمیشہ تقویٰ کی گود میں پلنے والے مجاہدوں ہی نے اسلام اور انقلاب کی نصرت و حفاظت کی ہے۔ یہ اثر ہے کربلای معلّیٰ میں موجود خواتین کا جنہوں نے اپنے کردار کے ساتھ سید الشہداء علیہ السلام اور جناب زینب کبریٰ علیہا سلام کا ساتھ دے کر تاریخ کے ایسے اوراق رقم کیے جن کی مثال نہ ملی ہے نہ مل سکے گی۔

☆☆☆☆☆

کربلا کی شعری روایت

سید نثار علی ترمذی

واقعہ کربلا اور امام عالی مقام کی لازوال قربانی کے اردو زبان پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اسے کئی حوالوں سے دیکھا جاسکتا ہے ایک تو وثائی ادب ہے جس میں مرثیہ، نوحہ، سلام، سوز اور دہہ وغیرہ شامل ہیں جو خالصتاً کربلا اور امام حسینؑ اور ان کے جانثاراں کے عظیم کارنامے کو نہ صرف بیان کیا گیا بلکہ اپنی عقیدت کا اظہار بھی کیا گیا یہ ایک اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ جس کی اہمیت اور معنویت مسلم ہے اس کے علاوہ بھی اردو، غزل اور نظم میں جا بجا کربلا، قربانی، علم، پیاس، خون وغیرہ ذکر کر کے شاعر نے اپنے مخاطبین پیغام دیا ہے اس کے علاوہ بھی بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ جن میں کربلا کے حوالے سے براہ راست کوئی علامت بیان نہیں ہوئی مگر شعر کا مفہوم بتا دیتا ہے کہ اس کا پس منظر کربلا سے حاصل کیا گیا ہے مثلاً

؎ قتل گاہوں سے چن کے ہمارے علم　　اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

گو اس شعر میں بظاہر کربلا کی مناسبت سے کوئی تذکرہ نہیں ہے مگر پڑھنے والا کربلا کے پس منظر تک پہنچ جاتا ہے زیر نظر مضمون میں وثائی ادب کے بجائے اردو ادب کا ایک مختصر سا جائزہ پیش ہے کہ جہاں کربلا کی نسبتیں اشعار میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔

اردو، میر تقی میرؔ سے پہلے بولی اور لکھی جا رہی ہے میرؔ کے دور سے ہی عموماً اردو کا حوالہ بیان کیا جاتا ہے مثلاً میرؔ کے یہ اشعار اگر چہ کسی سلام یا مرثیہ کا حصہ نہیں ہیں مگر کربلا کی مناسبت دیکھیے:

؎ شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہو　　سجدہ ایک اس تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں

یا یہ شعر:

؎ زیر شمشیر ستم میرؔ تڑپنا کیسا　　سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

یا یہ شعر:

؎ وااس سے سرحرف تو ہوگو کہ یہ سر جائے ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے

بظاہر یہ اشعار کسی عشقیہ غزل سے لئے گئے ہیں مگر ان میں اسی تاریخی روایت کا حوالہ ہے کہ جہاں سے ایمانی رشتوں کی روشنی ملتی ہے۔

مرزا غالبؔ کو اردو شاعری میں جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے مگر اس کے شعری مجموعہ میں اس حوالے کوئی تذکرہ نہیں ملتا ''یادگار غالب'' میں یہ تذکرہ ملتا ہے کہ جب انھوں نے کسی کے کہنے پر مرثیہ لکھنا شروع کیا تو چند بند لکھ کر چھوڑ دیا اور کہا ''یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جنھوں نے اس وادی میں عمریں بسر کی ہیں۔'' مگر غالب فارسی غزل میں حمد کے انداز میں کہہ چکے ہیں:

؎ بزم ترا شمع وگل خستگی بوتراب ساز ترا زیر و بم واقعہ کربلا

جب برصغیر میں آزادی کی تحریک چلی تو کربل کی روایت اردو شاعری پھولی پھلی مولانا محمد علی جوہر تحریک خلافت کے روح رواں تھے انھوں نے اپنی جدوجہد اور شاعری سے ہندوستان کے مسلمانوں کو زبان دی ان کے اشعار میں جا بجا کربلا کی مناسبت سے تذکرہ ملتا ہے ان کے یہ مشہور شعر جو آج بھی زبان زدعام ہے ملاحظہ کیجئے:

؎ قتل حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس کے علاوہ بھی مولانا کے اشعار ہیں کہ جن میں انھوں نے ظلم وجور، جبر استبداد کے خلاف کربلا کو ہی اپنا نمونۂ عمل بنایا ہے:

؎ پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کو خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

؎ فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے اب ادعائے پیروی پنجتن کہاں

؎ کہتے ہیں لوگ ہے رہ ظلمات پُرخطر کچھ دشت کربلا سے سوا ہو تو جانیے

؎ جب تک کہ دل سے محو نہ کربلا کی یاد ہم سے نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی

؎ بنیاد جبر وقہر اشارے میں ہل گئی ہوجائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا

؎ روز ازل سے ہے یہی اک مقصد حیات جائے گا سر کے ساتھ ہی سودائے کربلا

شہادت امام حسینؑ کے نئے پہلوؤں پر سب سے پہلے علامہ اقبالؔ نے اظہار خیال کیا ہے اقبال نے اردو فارسی میں اس کا تذکرہ ملتا ہے علامہ اقبال امام حسینؑ سے روشنی لے کر ملت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے:

؎ غریب وسادہ ورنگین ہے داستان حرم نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

؎ صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق معرکہ وجود میں بدر وحنین بھی ہے عشق

علامہ اقبال کربلا اور امام حسینؑ کو قربانی اسماعیلؑ کا تسلسل جانتے ہیں بلکہ ''ذبح عظیم'' کا مصداق قرار دیتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے فارسی کلام میں بھی کیا ہے:

؎ اللہ اللہ بائے بسمہ اللہ پدر معنی ذبح عظیم آمد پسر

یعنی کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کو جس عظیم قربانی سے بدل دیا گیا تھا وہ امام حسینؑ کی قربانی ہے اور یہ نکتہ کوئی آگاہ شخص ہی بیان کرسکتا ہے اور یہ قربانی مفہوم کی دلربا تفسیر بھی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ قربانی حسینؑ کا اسلام میں کیا مقام ہے اور منشاء ایزدی میں قربانی حسینؑ کب سے جلوہ گر تھی۔

اقبال کی شاعری میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں:

؎ حقیقت ابدی ہے مقام شبیری بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی

؎ قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں گرچہ ہے دابدار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

''بال جبرائیل'' میں علامہ ''فقر'' کے عنوان سے ایک مختصر نظم میں جس میں فقر کی اقسام بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی ودلگیری اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری میراث مسلمانی، سرمایہ شبیری

علامہ اقبال برصغیر کے مسلمانوں خصوصاً علماء کرام اور حجروں میں بند بزرگان دین کو دعوت فکر

دیتے ہیں:

؎ نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ دلگیری (ارمغان حجاز)

جس وقت علامہ نے یہ بات کی تو پوری امت محمدیؐ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی مگر علامہ انھیں رسم شبیری ادا کرنے کا کہہ رہے ہیں اقبال کی فکر کتابوں میں رہ جاتی مگر ایران میں ایک مرد جلیل نے رسم شبیری ادا کر کے اس فکر کو دنیا میں جیتا جاگتا مجسم کر دیا ہے آج جہاں بھی مسلمان مجبور ہیں وہ رسم شبیری ادا کر رہے ہیں یا اسی فکر کو اپنانے کی فکر میں ہیں لیکن اقبال یہ فکر دینے میں فوقیت حاصل کر گئے۔

علامہ اقبال کا کچھ کلام باقیات اقبال کے نام سے شائع ہوا ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے کلام کو مرتب کرتے وقت نظر انداز کر دیا تھا اس میں سے دو شعر پیش ہیں:

جس طرح مجھ کو شہید کربلا سے پیار ہے حق تعالیٰ کو یتیموں کی دعا سے پیار ہے

؎ رونے والا ہوں شہید کربلا کے غم میں کیا دُر مقصود نہ دیں گے ساقی کوثر مجھے

علامہ اقبال نے اپنے کلام کو وسعت اور زندہ و جاوید رکھنے کے لئے جہاں آفاقی نظریات پیش کئے وہاں فارسی زبان میں بھی اظہار خیال فرمایا علامہ کے فارسی کلام کو پڑھے بغیر ان کے نظریات بالخصوص ''نظر خودی'' سے مکمل آگاہی حاصل نہیں ہو سکتی۔

علامہ اقبال نے رموز بے خودی میں ''در معنی حریت اسلامیہ و سیر حادثہ کربلا'' کے عنوان سے امام عالی مقام کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس علامہ اقبال اسلام کی خصوصات بیان کرتے ہوئے کربلا کا تذکرہ کرتے ہیں شروع کے کچھ اشعار عقل و عشق کے ضمن میں ہیں اس کے بعد اقبال جب اصل موضوع پر آئے ہیں تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کردار حسینؑ کو کس نئی روشنی میں دیکھ رہے ہیں اور کن پہلوؤں پر زور دینا چاہتے ہیں حسینؑ کے کردار میں انھیں عشق کا وہ تصور نظر آتا ہے جو ان کی شاعری مرکزی نقطہ ہے اور اس میں انھیں حریت کا وہ شعلہ بھی ملتا ہے جس کی تب و تاب سے وہ ملت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے آیئے ان فارسی اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں:

؎ ہر کہ پیماں با ھُوَ الموجود بست — گردنش از بند ہر معبود رست

''جو شخص قوانین خداوندی کی اتباع کو مقصود زندگی قرار دے لے اور اسی طرح اپنا عہد و پیمان اللہ سے باندھ لے اس کی گردن میں کسی آقا کی غلامی اور محکومی کی زنجیر نہیں رہتی۔''

پہلے شعر کے بعد علامہ نے عشق و عقل کا خوبصورت موازنہ پیش کیا ہے یہ موازنہ پیش کر کے اقبال بتانا چاہتے ہیں کہ امام حسینؑ اور کربلا کو سمجھنے کے لئے عقل کافی نہیں بلکہ عشق کی نظر چاہئے امام عالی مقام کا یہ کارنامہ عقل کی بنا پر ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ عشق کی قوت کارفرما تھی اس لئے ایسے لوگ جو عقلی دلائل پر واقعہ کربلا کی توضیح کرتے ہیں وہ ہمیشہ شک و تردید کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو عشق کی نظر سے دیکھتے ہیں تو پھر وہ اس نتیجہ پر جا پہنچتے ہیں جہاں علامہ اقبال پہنچ گئے ہیں:

؎ عقش را آرام جاں حریت است — ناقہ اش را ساربان حریت است

''عشق کو کامل سکون اور اطمینان آزادی ملتا ہے اس کے ناقہ کی ساربان حریت ہے۔''

؎ آن شنیدیستی کہ ہنگام نبرد — عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد

اقبال تمہیدی اشعار کے بعد واقعہ کربلا کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں ''تم نے سنا ہے کہ کربلا کے میدان میں عشق نے عقل کے ساتھ کیا کیا۔''

؎ آں امام عاشقان پور بتولؑ — سرد آزادے ز بستان رسولؐ

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنی ذبح عظیم آمد پسر

عاشقوں کے امام حضرت فاطمہؑ کی اولاد اور حضورؐ کے گلستان کے پھول ہیں حضرت علیؑ ان کے والد بزرگوار ہیں اس میں ''اللہ اللہ'' وہ کلمہ تحسین ہے جو مرحبا اور شاباش کے معنوں میں آتا ہے اس کے بعد حضرت علیؑ کو ''بائے بسم اللہ'' سے یاد کیا گیا ہے یہ خود علامہ اقبال کی اہل بیتؑ شناسی پر ایک دلیل ہے امام حسینؑ کو ''ذبح عظیم'' کا مصداق قرار دیا ہے علامہ اقبال قربانی امام حسینؑ کو قربانی اسماعیلؑ کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔

؎ بہر آں شہزادہ خیر الملل — دوش ختم المرسلین نعم الجمل

روایت میں ہے کہ ایک دن نبی اکرمؐ اپنے دونوں نواسوں کو کندھوں پر سوار کر کے کھیلا رہے تھے آپؐ نے اس وقت فرمایا کہ تمہارا اونٹ کیسا اچھا ہے اور اس کی سواریاں کیسی خوب ہیں ''نعم الجمل'' اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

؎ سرخ رو عشق غیور از خون او　　شوخی ایں مصرع از مضمون او

امام حسینؑ کے خون کی رنگینی سے عشق غیور سرخ رو ہے کربلا کے واقعہ سے اس موضوع میں حسن اور رعنائی پیدا ہوگئی ہے۔

؎ درمیاں امت آں کیواں جناب　　ہمچو حرف قل ھواللہ در کتاب

امت محمدیہؐ میں آپؑ کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے قرآن مجید میں سورۂ اخلاص کی ہے سورۂ اخلاص میں توحید پیش کی گئی جو کہ قرآنی تعلیمات کا مرکزی نکتہ ہے اسی طرح امام حسینؑ کو بھی امت میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

؎ موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید　　ایں دو قوت از حیات آید پدید

؎ زندہ حق از قوت شبیری است　　باطل آخر داغ حسرت میری است

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش شروع سے چلی آرہی ہے اس کشمکش میں مجاہدین کی قوت بازو سے حق کا غلبہ ہوتا ہے اور باطل شکست و نامرادی سے دچار

؎ چوں خلافت رشتہ از قرآن گسیخت　　حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوہ خیر الامم　　چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

بر زمین کربلا بارید و رفت　　لالہ در ویرانہ کارید رفت

جب خلافت کا تعلق قرآن سے منقطع ہوگیا اور مسلمانوں کے نظام میں حریت فکر و نظر باقی نہ رہی تو اس وقت امام حسینؑ اس طرح اٹھے جیسے جانب قبلہ سے گھنگھور گھٹا اٹھتی ہے یہ بادل وہاں سے اٹھا کر بلا کی زمین پر برسا اور اسے لالہ زار بنا دیا۔

؎ تا قیامت قطع استبداد کرد　　موج خون او چمن ایجاد کرد

آپؑ نے اس طرح قیامت تک ظلم واستبداد کے راستے بند کردیئے اوراپنے خون کی سیرابی سے ریگزاروں کو چمنستان بنادیا۔

؎ بہرحق درخاک وخوں غلطیدہ است　　پس بنائے لاالٰہ گرویدہ است

آپؑ نے حق کے غلبہ کے لئے جان دے دی اوراس طرح توحید کی عمارت کی بنیاد بن گئے بنائے ''لاالٰہ'' میں تلمیح ہے خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اس مصرع کی طرف: ''حقا کہ بنائے لاالٰہ ھست حسینؑ''

؎ مدعایش سلطنت بودے اگر　　خودنکردے باچنیں سامان سفر

دشمناں چوریگ صحرالاتعد　　دوستان اوبہ یزداں ہم عدد

اگرآپؑ کا مقصد حصول سلطنت ہوتا تو اس بے سروسامانی میں نہ نکلتے بلکہ دیگر سامان واسباب سے قطع، ساتھیوں کی تعداد کے اعتبار سے دیکھئے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ مخالفین کالشکر لاتعداد تھا مگرآپؑ کے ساتھ صرف بہتر (72) نفوس تھے یہاں علامہ نے یزداں کے عدد ''72'' کا حوالہ دیا ہے۔

؎ سرابراہیمؑ واسماعیلؑ بود　　یعنی آں جمال راتفصیل بود

کربلا کے واقع میں قربانی اسماعیلؑ کی تفصیل ہے۔

؎ تیغ بہرعزت دین است وبس　　مقصداوحفظ آئین است وبس

مومن کی تلوار ہمیشہ دین کے غلبہ واقتدار کے لئے اٹھتی ہے ذاتی مفاد کے لئے نہیں اس کا مقصد آئین اورقانون کی حفاظت ہوتا ہے۔

؎ ماسوااللہ رامسلمان بندہ نسبت　　پیش فرعونی سرش افگندہ نسبت

مسلمان اللہ کے سوا کسی کا محکوم نہیں ہوتا اس کا سر کسی فرعون کے سامنے نہیں جھکتا۔

؎ خون اوتفسیرایں اسرارکرد　　ملت خوابیدہ رابیدارکرد

امام حسینؑ کے خون نے ان اسرارورموز دین کی تفسیر کردی اورسوئی ہوئی ملت کا جگایا۔

؎ تیغ لاچوازمیاں بیروں کشید　　ازرگ ارباب باطل خوں کشید

انھوں نے جب ''لا'' کو بے نیام کیا تو باطل کے خداؤں کی رگوں سے خون جاری ہو گیا۔

؎ نقش الا اللہ بر صحرا نوشت　　سطر عنوان نجات ما نوشت

باطل کے خداؤں کو مٹانے کے بعد انھوں نے سرزمین کربلا پر خدا کی توحید کا نقش ثبت کر دیا وہ توحید جو ہماری نجات کا سرعنوان ہے۔

؎ رمز قرآن از حسینؑ آموختیم　　بہ آتش او شعلہ ھا اندوختیم

ہم نے قرآن کے رموز و اسرار امام حسینؑ سے سیکھے ہیں ان کی حرارت ایمانی سے ہم نے شعلہ ہائے حیات کو جمع کیا ہے۔

؎ شوکت شام و فر بغداد رفت　　سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت

تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز　　تازہ از تکبیر او ایمان ہنوز

مسلمانوں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں بنی امیہ کی سلطنت دمشق میں بھی اور اندلس میں بھی، بنی عباس کی حکومت، یہ اپنے پورے عروج کے بعد ختم ہو گئیں لیکن داستان کربلا ابھی تک زندہ ہے ہمارے تار حیات میں پوشیدہ نغمے اسی مضراب سے بیدار ہوتے ہیں امام حسینؑ نے تکبیر کی جو آواز بلند کی تھی اس سے ہمارے ایمانوں میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

؎ اے صبا اے پیک دور افتادگاں　　اشک ما بر خاک پاک او رساں

اے صبا! تو ہماری نم آلود آنکھوں کا سلام مرقد امام حسینؑ تک پہنچا دے۔

علامہ اقبال کے کلام سے مذید مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں مگر صفحات کی محدودیت کی وجہ سے دیگر شعراء کا تذکرہ کرتے ہیں: جوش ملیح آبادی نے نوحے، مرثیے تصنیف کیے جس میں انھوں نے اپنے انقلابی خیالات کا اظہار اور بھی کھل کر کیا۔

؎ عباسؑ نامور کے لہو سے دھلا ہوا　　اب بھی حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

؎ دنیا تری نظیر شہادت لئے ہوئے　　اب تک کھڑی ہے شمع ہدایت لئے ہوئے

؎ انسان کو بیدار تو ہو لینے دو　　ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

علامہ اقبال، محمد علی جوہر اور جوش نے جو شاعری کو نئے افکار دیئے بعد میں آنے والے شعراء نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔

فراق گورکھپوری:

؎ خون شہید کا ترے آج ہے زیب دستاں نعرہ انقلاب ہے ماتم فتگاں نہیں

یاس یگانہ:

؎ ڈوب کر پار اتر گیا اسلام آپ کیا جانیں کربلا کیا ہے

احمد ندیم قاسمی:

؎ یہ شہادت ہے اس انسان کی کہ اب حشر تلک آسمانوں سے صدا آئے گی انساں انساں

؎ جب تجھ سے ہوئے مرے تشنہ دہن کے لب اے دشت کربلا تری قسمت بدل گئی

یہ راہ حق میں صرف شہادت نہ تھی ندیم اک زندگی فنا سے بقا تک نکل گئی

علی سردار جعفری:

؎ دنیا کی شہادت گاہ میں ہو جو اپنے لہو سے سرخ کفن

ہے چاک جگر کی شرط یہاں یہ حلقہ دل افگاراں ہے

؎ در دریا ہے ایک بہتا ہوا جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں

وہی تلوار اور وہی مقتل صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

مجید امجد:

؎ سلام ان پہ تہہ تیغ بھی جنھوں نے کہا جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے

مجید امجد عہد رفتہ کا ایک منفرد شاعر ہے جب بھی چند بڑے شعراء کا نام لیا جاتا ہے تو مجید امجد کا نام ضرور لیا جاتا ہے حضرت زینب عالیہؑ کی خدمت میں یوں نذرانہ پیش کرتے ہیں:

وہ قتل گاہ، وہ لاشے، وہ بے کسوں کے خیام وہ شب، وہ سینہ کونین میں غموں کے خیام

وہ رات، جب تری آنکھوں کے سامنے لرزے

مرے ہوؤں کی صفوں میں، ڈرے ہوؤں کے خیام

یہ کون جان سکے، تیرے دل پہ کیا گذری　　لٹے جب آگ کی آندھی میں، غمزدوں کے خیام

ستم کی رات، کالی قنات کے نیچے　　بڑے ہی خیمہ دل سے تھے عشرتوں کے خیام

تری ہی برق صدا کی کڑک سے کانپ گئے　　بہ زیر چتر مطلا شہنشہوں کے خیام

جہاں پہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی ردا　　اکھڑ چکے ہیں ترے آنگنوں کے خیام

منیر نیازی ہمارے عہد کے ایک اہم اور منفرد آواز ہے جنھوں نے اپنے مجموعے ''دشمنوں کے درمیان'' کا انتساب ہی امام حسین علیہ السلام کے نام سے کیا ہے۔

؎ خواب جمال عشق کی تعبیر ہے حسینؑ　　شام ملال عشق کی تصویر ہے حسینؑ

مصطفیٰ زیدی کا ایک نامکمل مرثیہ ''کربلا اے کربلا'' بہت مشہور ہے اس کے علاوہ ان کے اشعار میں کربلا کے حوالے سے ذکر ملتا ہے۔

؎ نام حسینیت پہ سر کربلائے عصر　　کس کا علم ہے کس کے علمدار دیکھنا

مجھ پر چلی ہے عین بہ ہنگامۂ سجود　　اک زہر میں بجھی ہوئی تلوار دیکھنا

؎ غیر تو رمز غم کون و مکاں تک پہنچے　　کربلا تیرے یہ غمخوار کہاں تک پہنچے

شہرت بخاری:

؎ جز حسینؑ ابن علیؑ مرد نہ نکلا کوئی　　جمع ہوتی رہی دنیا سر مقتل کیا کیا

؎ آل نبی پر تنگ ہے اب تک ہر کوفے کی بستی　　پائے امیر شام یہ سجدہ عین عبادت ٹھہری

؎ پھر کوئی حسینؑ آئے گا اس دشت ستم میں　　پرچم کسی زینب کی ردا ہوتی رہے گی

افتخار عارف کی شاعری میں کربلا کی تمام علامات نئے روپ لئے ہوئے ہیں:

؎ وہی پیاس ہے وہی دشت ہے وہی گھرانا ہے　　مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن　　راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

؎ خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے　　نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

پتھر پہ سر رکھ کر سونے والے دیکھے ہاتھوں میں پتھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

خلیل الرحمٰن عظمی (آف انڈیا):

؎ سیاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا

؎ بس اک حسین کا نہیں ملتا کہیں سراغ یوں ہر گلی یہاں کی ہمیں کربلا لگی

شاذ تمکنت (آف انڈیا):

؎ کچھ لوگ تھے جو دشت کو آباد کر گئے اک ہم ہیں جن کے ہاتھ سے صحرا نکل گیا

شہریار (آف انڈیا):

؎ حسینؑ ابن علیؑ کربلا کو جاتے ہیں مگر یہ لوگ ابھی تک گھروں کے اندر ہیں

فارغ بخاری:

ہے فخر نسبت شبیر پر ہمیں فارغؔ بغاوتوں کی روایت ہمارے گھر سے چلی

عبید اللہ علیم:

؎ اس قافلے نے دیکھ لیا کربلا کا دن اب رہ گیا ہے شام کا بازار دیکھنا

سلیم کوثر:

؎ یہ فقط عظمت کردار کے ڈھب ہوتے ہیں فیصلے جنگ کے تلوار سے کب ہوتے ہیں

؎ جھوٹ تعداد میں کتنا ہی زیادہ ہو سلیمؔ اہل حق ہوں تو بہتر بھی غضب ہوتے ہیں

اقبال ساجد:

؎ تو نے صداقتوں کا نہ سودا کیا حسینؑ باطل کے دل میں رہ گئی حسرت خرید کی

امیر مینائی:

؎ جو کربلا میں شاہ شہیداں سے پھر گئے کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے

اے۔ جی جوش:

؎ کیں دفن جو یزید نے اقدار دین کی پھر زندہ کر گئی ہے کرامت حسینؑ کی

بہادر شاہ ظفرؔ:

؎ سکینہ نے کہا رو کر کہ میرے کان دکھتے ہیں — اتارا ے شمر میری بالیاں آہستہ آہستہ
جو چلنا ہے تو چل ظفرؔ اب شاہ کے روضے پر — گذر جائے گی عمر رواں آہستہ آہستہ

ڈاکٹر بیدل حیدری:

؎ دشت کرب و بلا کا حال نہ پوچھ
دور تک گرد یاس ملتی ہے
بھوک ملتی ہے پیاس ملتی ہے
لیکن اس دشت میں مسافر کو
ایک مینار نور ملتا ہے
جس سے درس شعور ملتا ہے

نثار رسید:

؎ نہ سر پہ چادر زہرا نہ ساتھ بھائی کا — تیرے نصیب میں زینب عجب سفر آئے
حسینیت سے کرو اخذ رسم حق گوئی — سواد جبر میں مشکل گھڑی آئے

قمر جلالوی:

؎ اصغر جگر کو تھام کے روتی ہے فوج شام — تم تیر کھا کے آئے ہو یا تیر مار کے

گلزار بخاری:

؎ کسی سے اب کوئی بیعت نہیں طلب کرتا — کہ اہل تخت کے ذہنوں میں ڈر حسین کا ہے

محسن نقوی:

شبیر کے ہاتھوں پر تو اصغر تھا وہ لیکن — نکلا سر میداں علی اکبر کے برابر
محسنؔ کو نہیں خوف تکبیر رین لحد میں — کو آئے گا مولا تیرے نوکر کے برابر
اس کم سنی میں یوں صف اعدا سے انتقام — اصغر تو ابتدا میں ہوا انتہا پسند
ثابت ہوئی یہ بات دیار دمشق میں — زینب خدا کے دین کو تیری ردا پسند

حوالہ جات

اس مضمون کے لکھنے میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

۱۔ برصغیر کے امامیہ مصنفقین کی مطبوعہ تصانیف اور تراجم۔ جلد اول

۲۔ سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ از گوپی چند نارنگ

۳۔ اقبال در مدح محمد و آل محمد از سید احسن ترابی

۴۔ مجلس اقبال از غلام احمد پرویز

۵۔ بنائے لا الٰہ از غضنفر علی ندیم

۶۔ باقیات اقبال

۷۔ مثنوی رموز بے خودی

☆☆☆☆☆☆

قیام کربلا اور حسینیؑ عزت

حجة الاسلام سید فرحت علی کاظمی

امام حسینؑ کی شخصیت کسی بھی فرد اور قوم سے پوشیدہ نہیں ہے آپ کی تحریک عاشورا اور مقصد کسی ایک فرقہ اور گروہ کے لئے نہ تھا بلکہ جس طرح رسول خداؐ کی رحمت واسعہ اور آپؐ ''رحمۃ للعالمین'' ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ﴿وماارسلناک الاّ رحمة للعالمین﴾ ہم نے آپؐ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اسی طرح امام حسینؑ کا ہدف اور مقصد کسی ایک فرد کے لئے نہیں بلکہ تمام عالمین کے لئے تھا جیسا کہ آپؑ سے جب مدینہ سے کربلا کی طرف جانے کا مقصد پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

''انی لم اخرج اشراً ولابطهراً ولامفسداً ولاظالماوانماخرجتُ لطلب الاصلاح فی امةٍ جدی رسول الله اریدان امربالمعروف نهیٰ عن المنکر واسیربسیرة جدی وابی علی ابن ابی طالبؑ''

''میں کسی شر، فساد، خوش گذرانی اور ظلم کے لئے مدینہ سے نہیں جارہا ہوں بلکہ میں اپنے جد کی امت کی اصلاح کے لئے جارہا ہوں میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف کروں اور نہی ازمنکر کروں اور اپنے جد اور والد علی ابن ابی طالبؑ کی سیرت پر عمل کروں۔''[1]

امامؑ کا یہ امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کرنا تمام عالم اسلام کے لئے تھا تاکہ ہر فرد اس سے فائدہ اٹھائے اور اپنے آپ کو ذلت اور رسوائی کی لعنت سے نجات دے اور اسلام کے لئے ایسا وقت تھا کہ جس میں سنت الٰہی ختم ہورہا تھا اور بدعتوں کی ایجاد ہورہی تھی اس لئے اس وقت ایک الٰہی نمائندہ کی ذمہ داری یہی ہوتی ہے کہ اگر اس نمائندہ خدا کو جان کا نذرانہ ہی کیوں نہ پیش کرنا پڑے اس بڑی قربانی سے بھی وہ ہستی دریغ نہ کرے امامؑ نے جو خط بصرہ کے بزرگوں کو لکھا اس میں آپؑ نے فرمایا کہ ''میں تمہیں کتاب خدا اور سنت رسول خداؐ کی طرف دعوت دیتا ہوں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ سنت مردہ ہوچکی

ہے اور بدعتیں زندہ ہو چکی ہیں۔''[۲]

ایسے وقت میں کہ جب بدعتوں کو زندہ کیا جا رہا ہو خداوند متعال کا حقیقی نمائندہ ہی وہ عمل انجام دے سکتا ہے کہ جس کی وجہ سے بدعتیں مردہ ہو جائیں اور اسلام اور سنت الٰہی زندہ و جاوید ہو سکے اور امامؑ نے اس کام کو انجام دینے کے لئے مدینہ سے کربلا تک کا سفر کیا اور بالآخر خدا کے راستے میں قربانیاں پیش کیں اور اپنے مقصد اور ہدف کو تمام عالم اسلام تک پہنچایا۔

یہ وہ مقاصد اور اہداف تھے جو امامؑ نے اپنے فرامین میں بیان فرمائے ہیں اور ایک اہم ترین نقطہ اور ہدف جو امامؑ نے اپنے فرامین میں بیان فرمایا ہے وہ ہے عزت حسینیؑ جیسا کہ امامؑ فرماتے ہیں: ''**هيهات منا الذلة**''، ''ذلت مجھ حسینؑ سے دور ہوئی۔''

ذلت سے دور ہونا یعنی عزت کو چاہنا، ذلت انسان کے لئے نقص ہے اور عزت انسان کے لئے کمال امام حسینؑ اپنے لئے بھی اس کمال کے خواہاں ہیں اور تمام عالم اسلام کے لئے بھی اس کمال کو چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ انسان عزت اور کمال کی طرف جائے اور ہر وہ عمل جو انسان کو ذلت یا نقص کی طرف لے جائے اس سے وہ دور ہے اور یہی ھادیان برحق کا ہدف ہوا کرتا ہے کہ ﴿**ان هديناه' السبيل اما شاكراً و اما كفوراً**﴾ [۳]

''ہم نے راستے کی ہدایت کر دی چاہے تو وہ شکر کرے اور چاہے تو وہ انکار کر لے۔''

عزت اور ذلت دو ایسے مفاہیم ہیں کہ دونوں ایک جگہ پر جمع نہیں ہو سکتے یعنی ایک انسان میں یا عزت آ سکتی ہے یا ذلت دونوں ایک جسم و بدن میں جمع نہیں ہو سکتے یعنی امام حسینؑ کی ذات ہی عزت کا مفہوم ایک ایسا مفہوم ہے کہ جس کے لئے امامؑ نے اتنی قربانیاں دیں تا کہ امامؑ باقی مقاصد کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو ذلت میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے آپ نے دیگر مقاصد کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے حوالے سے بھی اہم ترین کردار ادا کیا۔

عزت کے معنی:

باب ''عَزَ. يَعِزُّ، ضَرَبَ يَضْرِبُ'' سے ہے کہ جو کلام عرب میں عزیز ہونا' قوی ہونا'

سخت، محکم اور استوار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔۴ ابتداء زمانہ میں یہ کلمہ جمادات کی توصیف کے لئے استعمال ہوتا تھا جیسا کہ کہا جاتا تھا "اَرْضٌ عِزَازٌ" یعنی محکم زمین۔۵

راغب اصفہانی فرماتے ہیں: "اَلْعِزَّةُ حَالَةٌ مَانِعَةٌ لِلْاِنْسَانِ مِنْ اَنْ يَغْلَبُ" عزت ایک ایسی حالت ہے کہ جو باعث بنتی ہے کہ انسان پر کوئی غلبہ نہ کرے۔۶ زجاج عزیز کی تعریف میں لکھتا ہے: "**هو الممتنع فلايغلبه شئ**"۷ "عزیز ایسی ذات کو کہتے ہیں کہ جس پر کوئی چیز غلبہ نہ کرے۔ چونکہ یہ کلمہ ایک مثبت کلمہ ہے اس لئے مختلف علماء نے اس کے لئے بہت سے کلمات ذکر کیئے ہیں جیسا کہ رفعت، قوت، غلبہ، شدت، معانی رکھتا ہے البتہ یہ مسلم ہے کہ یہ ایک ایسا لفظ ہے کہ ہر انسان کے لئے پسندیدہ ہے اور کوئی بھی شخص اس لفظ کو تنفر کی نظر سے نہیں دیکھتا۔

عزت، قرآن مجید میں:

قرآن مجید میں لفظ "عزة" کئی مقامات پر آیا ہے البتہ لفظ عزت کبھی مثبت معنی میں آیا ہے اور کبھی منفی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ کفار کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے: ﴿**الذين يتخذون الكافرين اولياء من دون المؤمنين ايبتغون عندهم العزة فان العزة لله جميعاً**﴾۸

"یہ وہ لوگ ہیں جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو سرپرست بناتے ہیں کیا وہ ان کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں تو بیشک سب عزت اللہ ہی کے لئے ہے۔"

اس آیۂ مبارکہ سے پتہ چلتا ہے کہ عزت ایک ایسی چیز ہے کہ جس کا خواہاں ہر شخص ہے چاہے وہ مومن ہو یا کافر چونکہ یہ ایک ایسا مفہوم ہے کہ جو عقل کے نزدیک حَسَن ہے اور اسی وجہ سے کفار بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ عزت کے مالک ہوں اور عزت ان کے پاس ہو لیکن وہ نہیں جانتے کہ عزت کا مالک صرف اور صرف خداوند متعال ہے جو بھی اس عزت کو چاہتا ہے اسے خداوند متعال کے اصول اور دستور العمل کے مطابق اپنی زندگیوں کو استوار کرنا ہوگا تا کہ حقیقی عزت ان کو مل سکے جبکہ خداوند متعال کے علاوہ کوئی اور ذات اور شخصیت ایسی موجود نہیں ہے جس کے پاس عزت ہو اگر چہ بعض

غیر مسلم افراد یہ سمجھتے ہیں کہ عزت ان کے پاس ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عزت اور غلبہ ان کے پاس نہیں ہے ان کے پاس یہ عزت ایک ایسی دلدل ہے کہ جس کو وہ لوگ حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں جبکہ یہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اسی وجہ سے خداوند متعال فرماتا ہے: ﴿**ولا یحزنک قولھم ان العزۃ للّٰہ جمیعاً ھو السمیع العلیم**﴾[9]

''اور تجھے ان کی بات غم میں نہ ڈالے یقیناً سب عزت اللہ ہی کے لئے ہے وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔'' غلبہ اور عزت فقط خداوند متعال کے پاس ہے اور وہ افراد جو غیر خدا کو ماننے والے ہیں ان کا دعویٰ فقط دعویٰ ہے جبکہ حقیقی عزت صرف خداوند متعال کے پاس ہے۔

معزز کون؟

قرآن مجید سورۂ منافقون میں ان لوگوں کے لئے فرماتا ہے کہ جو عزت کے حقیقی طور پر مالک ہیں اور عزت ہمیشہ ان کے پاس ہے اور ان افراد کے مخالف کبھی بھی اس عزت کے مستحق نہیں ہوسکتے: ﴿**یقولون لئن رجعنا الیٰ المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل وللہ العزۃ ولرسولہٖ وللمؤمنین ولکن المنافقین لایعلمون**﴾[10]

''وہ کہتے ہیں اگر ہم مدینہ کی طرف پلٹ گئے تو جو زیادہ عزت دار ہے وہ اس میں سے ذلیل کو ضرور بضرور نکال دے گا اور عزت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لئے ہی ہے لیکن منافق لوگ نہیں جانتے۔''

اس آیۂ مبارکہ میں خداوند متعال نے عزت کو تین افراد کے لئے مختص کیا ہے ایک خود خداوند متعال دوم: رسول گرامی اسلامؐ اور سوم: مومنین۔ اور اس عزت کو ذلت کے مقابلے میں قرار دیا ہے یعنی عزت اور ذلت ایک دوسرے کے مقابلے میں ہیں اور اس آیہ میں عزیز لوگوں کو منافقین کے مقابلے میں قرار دیا گیا ہے پس اگر گذشتہ آیات کو دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ خدا کے مقابلے میں کفار بھی ہیں اور منافقین بھی پس یہ دونوں عزت کے مستحق نہیں ہوسکتے کیونکہ خدا اور رسول خداؐ اور مومنین کے خلاف ہیں۔

﴿من کان یرید العزة فلله العزة جمیعاً الیه یصعد الکلم الطیب و العمل الصالح یرفعه و الذین یمکرون السیاٰت لهم عذاب شدید و مکر اولئک هو یبور﴾[11]

''جو کوئی عزت چاہتا ہے پس اللہ تعالیٰ ہی کے لئے سب عزت ہے اسی کے حضور میں پاکیزہ کلمے بلند ہوتے ہیں اور نیک عمل بھی کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی اس کو بلند کرتا ہے اور جو لوگ برائیوں کی تدبیر کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کی خفیہ تدبیر وہی تو تباہ ہوں گی۔''

عزت ان بلند کلمات میں سے ہے جنھیں بلندی خداوند متعال نے عطا کی ہے جو بھی ان کلمات کو بلندی اور اعمال کو نیکی کی طرف لے کر جائے گا وہ حقیقی معنی میں خداوند متعال کا نمائندہ ہوگا اور جو شخص برائیوں کی تدبیر کرے گا جیسا کہ یزید لعین نے برائیوں کی تدبیر کی، حلال رسول خدا کو حرام اور حرام رسول خداؐ کو حلال کیا اور دین اسلام کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ اسلام اپنی حقیقی شکل کھو رہا تھا اور اسی وجہ سے امامؑ کی ذمہ داری تھی کہ امامؑ ایسے حالات میں اسلام کو دوبارہ حقیقت کی طرف لائیں اگر چہ اس کے لئے انھیں بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے، وہ اس سے دریغ نہ کریں کیونکہ حقیقی نمائندہ ہی ایسا کرسکتا ہے اور انھیں وجوہات سے پتہ چلتا ہے کہ دین مبین کا حقیقی نمائندہ کون ہے؟

اسی لئے خداوند متعال نے ان لوگوں کہ جنھوں نے برائیوں کی تدبیر کی ان کے لئے سخت عذاب کی بشارت دی ہے البتہ کہا جاسکتا ہے کہ خداوند متعال نے قرآن مجید میں ایسے الفاظ استعمال کیئے ہیں کہ جن کا معنی مثبت ہے لیکن ان کا استعمال منفی معانی میں بھی کیا ہے جیسے ''بشارت اور آئمہ'' اور ان جیسے دیگر الفاظ کہ جو مثبت معانی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن خداوند متعال نے اپنے مخالفین کے لئے بھی استعمال کیئے ہیں: ''**فقاتلوا آئمة الکفر**''، کفر کے اماموں کو قتل کردو یعنی اس موقع پر خداوند متعال نے آئمہ کفار کے لئے مجاز کے طور پر استعمال کیا ہے اور منفی معنی میں ہے یعنی امام دو قسم کے ہیں ایک امام برحق اور دوسرا امام کفر اور وہ جو خداوند متعال کا حقیقی نمائندہ ہے اس کو امام برحق کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں ہے: ﴿**یوم ندعوا کل اناس بامامهم**﴾ ''اس دن سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا''

اگر امام حق ہے تو اس کے ساتھ بلایا جائے گا اور جو امام کفر ہیں ان کو اپنے پیروکاروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

عزت 'روایات میں:

روایات معصومینؑ میں بھی اس اصول (عزت) کا خداوندمتعال کے ساتھ منسوب ہونا ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور روایات میں اس اصول کے بارے میں بہت زیادہ کی گئی ہے جیسا کہ حضرت امیرالمؤمنین علی بن ابی طالبؑ فرماتے ہیں: ﴿**کل عزیزٍ بغیرہٖ ذلیل**﴾ ۱۲ ''ہر عزیز خداوندمتعال کے علاوہ ذلیل ہے۔''

مقصد اور ہدف خداوندمتعال ہے جو بھی خدا کے ساتھ ہے یہ عزیز ہے اور یہی عزت اس شخص کے لئے حقیقی عزت ہے لیکن اگر خداوندمتعال اس کے ساتھ نہیں ہے تو یہی عزت اس کے لئے ذلت ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر امام علیؑ فرماتے ہیں: ﴿**العزیز بغیر اللہِ ذلیل**﴾ ۱۳ ''اگر کوئی شخص خداوندمتعال کی مدد کے بغیر عزیز ہونا چاہے تو وہ ذلت اور بدبختی سے دوچار ہو جائے گا۔'' اسی وجہ سے امام حضرت علیؑ اپنی مناجات میں فرماتے ہیں:

﴿**الٰھی کفٰی لی عزاً ان اکون لک عبداً**﴾ ۱۴ ''خدایا! میری عزت کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔'' اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿**من اراد عزاً بلاعشیرۃ وغنی بلامالٍ وھیبۃ بلاسلطان فلینقل من ذل معصیۃ اللہ الی عز طاعتہٖ**﴾ ۱۵ ''جو کوئی بھی اپنے خاندان کے بغیر عزت چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ بغیر مال کے بے نیاز ہو جائے اور بغیر سلطنت کے ھیبت حاصل کر لے تو وہ خداوندمتعال کی نافرمانی سے نکل کر اُس کی کی اطاعت میں آجائے چونکہ فقط اطاعت میں ہی عزت ہے۔''

ذلت اور عزت دونوں ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے اس لئے کہ یہ دونوں متضاد معانی میں سے ہیں اور ذلت معصیت کے ساتھ ہے اور عزت اطاعت کے ساتھ جب اطاعت خداوندی ہوگی تو عزت بھی اسی شخص کو عطا ہوگی لیکن ضروری ہے کہ اطاعت خداوندمتعال کے لئے ہو اور کسی دوسرے کو اس

اطاعت میں شریک نہ ٹھہرائے اسی وجہ سے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں: ﴿**لاعزّ اعز من التقویٰ**﴾: ''کوئی عزت تقویٰ سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔''[۱۶] عزت جب خدا سے ڈرنا، پرہیزگاری، زہد اور ورع جیسی اشیاء کے ساتھ ہو تو حقیقت میں عزت ہوگی لیکن اگر تقویٰ کے مقابلے میں ہو تو یہ ذلت ہوگی امام علیؑ کا قول ہے کہ ﴿**لاعزّ کالحلم**﴾ ''کوئی بھی عزت حلم اور بردباری کی طرح نہیں ہے۔''[۱۷] اسی طرح حضرت امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں: ﴿**اِقْنَعْ تعزّ**﴾ ''قناعت کرو تا کہ عزیز ہو جاؤ۔''[۱۸]

جب حضرت امام حسینؑ نے اپنے والد بزرگوار سے عزت کی تعریف چاہی تو آپؑ نے فرمایا تھا کہ لوگوں سے بے نیاز ہونے کو عزت کہتے ہیں ﴿**مسئل الحسینؑ.....فما عز المرء .قال استغناؤه عن الناس**﴾[۱۹]

اگر روایات اور قرآن میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ عزت خداوند متعال ہی کے ساتھ مختص ہے اور یہ ایک ایسی عطا ہے جو فقط مؤمنین کو عطا کی گئی ہے اور اس کے علاوہ کسی کو بھی اس جیسی عطا سے فیض یاب نہیں کیا گیا اور اگر دیکھا جائے تو خداوند کی صفت ''رحم'' اسی بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خداوند متعال رحیم ہے یعنی رحم کرنے والا ہے فقط مومنین پر نہ کہ ہر انسان، ہر موجود اور ہر ممکن الوجود پر اسی وجہ سے حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

﴿**ان اللہ عزوجل فوّض الی المؤمن اموره کلّها ولم یغوض الیه ان یکون ذلیلاً: اماستمع قول الله عزوجل یقولُ "ولله العزة ولرسوله وللمؤمنین" فالمؤمن یکون عزیزاً ولایکون ذلیلاً. ثم قال ان المؤمن اعز من الجبل. ان الجبل یستقل منه بالمعاول والمؤمن لایستقل من دینه شئ**﴾

''بے شک خداوند متعال نے اپنے تمام امور مومن کو عطا کیئے ہیں البتہ اسے اجازت نہیں دی کہ وہ ذلیل ہو کیا آپ نے نہیں سنا کہ خداوند متعال فرماتا ہے: عزت اللہ، اس کے رسولؐ اور مومنین کے لئے ہے پس مؤمن کو ہمیشہ عزیز ہوتا ہے اور کبھی بھی ذلیل نہیں ہوتا پھر آپ نے فرمایا مؤمن پہاڑ

سے زیادہ عزیز (سخت) ہوتا ہے کیونکہ پہاڑ کو ابدان سے ریزہ ریزہ کیا جاسکتا ہے لیکن مومن کے دین سے کوئی چیز کبھی بھی کم نہیں ہوسکتی۔''[۲۰]

اس سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مومن اس کو کہتے ہیں جو دین پر ایمان اس طرح لائے کہ اس ایمان میں دوام پایا جائے اور اس کے ایمان میں زیادتی ہوسکتی ہے لیکن کمی نہیں ہوسکتی وہ اساس اور اصل جس کی وجہ سے انسان گمراہی کی طرف چلا جاتا ہے اور دین سے دور ہوجاتا ہے۔ معصومؑ فرماتے ہیں: ﴿**اللھم عرّفنی نفسک فانک ان لم تعرفنی نفسک لم اعرف رسولک اللھم عرّفنی رسولک فانک ان لم تعرفنی رسولک اعرف حجتک اللھم عرّفنی حجتک فانک ان لم تعرفنی حجتک ضللت عن دینک**﴾

''الٰہی! مجھے اپنے نفس کی معرفت عطا فرما اور اگر تو نے اپنے نفس کی معرفت عطا نہ فرمائی تو میں تیرے رسول کی معرفت حاصل نہیں کرسکتا اور اے اللہ! تو مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا فرما اور اگر تو نے مجھے اپنے رسول کی معرفت عطا نہ فرمائی تو میں تیری حجت کی معرفت حاصل نہیں کرسکتا بارالہا! مجھے اپنی حجت کی معرفت عطا فرما اور اگر تو نے مجھے اپنی حجت کی معرفت عطا نہ فرمائی تو میں تیرے دین سے گمراہ ہوجاؤں گا۔''[۲۱] دین سے گمراہی کے سبب تین ہیں: 1 -عدم معرفت خداوند متعال 2-عدم معرفت رسول خداؐ 3-امام معصومؑ کی معرفت نہ ہونا

اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی کم ہوجائے تو شخص مومن نہیں رہتا اور قول معصومؑ کے مطابق مومن وہی ہے جو ان تینوں معرفتوں کو حاصل کرلے ورنہ دین سے بہرہ مند نہیں ہوسکے گا۔

امام حسینؑ اور عزت:

چونکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہم امام حسینؑ کی زندگی میں دیکھیں کہ عزت، امام حسینؑ کے نزدیک کیا حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے اب ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ کے نزدیک عزت اور ذلت کیا ہیں اور عزت جو کہ ہر فرد کے نزدیک حسن ہے اور ذلت جو کہ ہر شخص چاہے مسلمان ہو یا کافر کے نزدیک قبیح اور بری ہے، امام حسینؑ کے اس قیام میں عزت کتنی عظیم شئ ہے کہ امامؑ نے اس عزت کو مقصد

اور ہدف قرار دیا ان دیگر اہداف کی طرح امام حسینؑ کا تاکید کرنا عزت پر اور وہ عزت جو قرآن مجید کی نظر میں عزت ہے اسی عزت پر انحصار کیا ہے اسی لئے آپؑ فرماتے ہیں: ﴿**الٰھی کفٰی لی عزاً ان اکون لک عبداً**﴾ ''خدایا! میری عزت کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔''

دعائے عرفہ میں امام حسینؑ مناجات کرتے ہوئے اپنے خدا سے یوں راز و نیاز کرتے ہیں: ﴿**یامن خصّ نفسه بالسمو و الرفعة و اولیائهُ بعزه یعستزون**﴾ ''اے وہ ذلت جس کا نفس بلندی اور رفعت کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے اولیاء اس کی عزت سے تمسک کی وجہ سے عزت پاتے ہیں۔''[۲۲]

پس عزت خداوند متعال کے ساتھ ہے اسی وجہ سے امامؑ فرماتے ہیں کہ ''بارالٰھا! اگر تجھے پا کر ساری دنیا کو کھو دیا تو سب کچھ پالیا اور اگر تجھ کو کھو کر سب کچھ پالیا تو کچھ بھی نہ پایا۔'' پس خداوند متعال کو پالینا ہی ہر قسم کی عظمت کو پالینا ہے اور خداوند متعال کو پالینے سے ہی ہر قسم کی عزت، بلندی، عظمت، رفعت اور ہر قسم کی بہترین صفت انسان میں آجاتی ہیں لیکن اگر خداوند متعال سے دور ہوئے تو کوئی بھی اچھی صفت انسان کے نزدیک نہیں آسکتی۔

اور پھر آپ نے فرمایا: ﴿**یامن دعوتهُ .....ذلیلاً فاعزنی**﴾ ''اے وہ کہ جس کو میں نے حالت ذلت میں پکارا بارالٰھا! مجھے عزت عطا فرما۔''[۲۳] ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: ﴿**انت اللہ اعززتُ**﴾ ''(اے اللہ) تو ہی وہ ذات ہے کہ جس نے مجھے عزت بخشی۔''[۲۴]

امامؑ کے مطابق اگر عزت انسان کے پاس ہے تو سب کچھ ہے اور یہ عزت امامؑ نے خداوند متعال کی طرف نسبت دی ہے کہ وہی ذات ہی عزت عطا کرتی ہے تمام عزتوں کا سرچشمہ، منبع اور مخزن وہی ذات ہے اسی وجہ سے آپ فرماتے ہیں: ﴿**موت فی عزّ خیرٌ من حیاة فی ذل**﴾[۲۵] ''ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔''

جیسا کہ ہم نے تاریخ میں دیکھا کہ امامؑ کے نزدیک یزید اور اس جیسوں کی بیعت کرنا ذلت کے مترادف ہے کیونکہ یزید تمام صفات رذیلہ کا پیکر تھا اور صفات حسنہ رکھنے والا شخص صفات رذیلہ

رکھنے والے شخص کی بیعت نہیں کرسکتا کیونکہ حقیقت میں یہی ذلت ہے جبکہ اس کے برعکس ذلت نہیں بلکہ عزت ہے یعنی امام جو کہ خداوندمتعال کے حکم سے اس منصب پر فائز ہوتا ہے اس کی بیعت میں آنا ہی عزت ہے کیونکہ یہ امامت خداوندمتعال نے عطا کی ہے اورعزت ہمیشہ اللہ، اس کے رسولؐ اور مومنین حقیقی کے لئے ہے چونکہ یہ افراد تحت فرمان خداوندمتعال ہوتے ہیں اور جو بھی خدا کے فرمان کے سامنے جھک جائے اصل عزت اسی کے لئے ہی ہے اسی وجہ سے آپ نے اور فرامین میں بھی ایسی موت کو سعادت کہا ہے:﴿**انی لااریٰ الموت الاسعادۃ والحیاۃ مع الظالمین الا برماً**﴾ ''میرے نزدیک موت سعادت ہے اورظالمین کے ساتھ (ان کے حق میں) رہنا ذلت اوررسوائی ہے۔''۲۶

سعادت وشقاوت، عزت وذلت، حسن وقبیح، عدل اور جھوٹ ان تمام الفاظ اورمفاہیم سے پتہ چلتا ہے کہ دوراستے ہیں اور تیسرا راستہ وجودنہیں رکھتا ایک اچھااورحسن راستہ اوردوسرا ُبراراستہ اوراگرانسان کوابتدائے آفرینش سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ مقصد خدابھی یہی تھا کہ انسان کوئی ایک راستہ اپنے لئے منتخب کرے:﴿**ان ھدیناہ' السبیل اما شاکراً واما کفوراً**﴾ ''ہم نے انسان کی راستوں کی طرف ہدایت کردی چاہےتو وہ شکرکرےاور چاہے کفرکرے۔''۲۷

ضروری ہے کہ انسان اپنا ہدف معین کرے کہ اس کا راستہ کون سا ہے امام حسینؑ کا راستہ اس کا راستہ ہے یا پھریزید لعین کا راستہ اس کا راستہ ہے چونکہ تیسرا راستہ موجودنہیں ہے یعنی یا حزب اللہ ہے یا پھرحزب الشیطان ہے پس ضرورت ہے اس امر کی کہ انسان اپنا ہدف معین کرے بغیر ہدف معین کئے اس کی زندگی ایک چوپائے کی زندگی ہوگی کہ جس کا کوئی مقصد اور ہدف نہیں ہوتا امام حسینؑ فرماتے ہیں:﴿**مرحباً بالقتل فی سبیل اللہ وللنکم لاتقدرون علی ھدم مجدی ومھو عزی وشرفی فاداً لاابالی بالقتل**﴾ ''خداوندمتعال کے راستے میں موت بہترین موت ہے لیکن مجھے قتل کرنے سے تم میری بزرگی وعظمت' عزت اورمیرے شرف کوکم نہ کرسکو گے کیونکہ میں موت سے نہیں ڈرتا۔''۲۸

پتہ چلا کہ وہ موت جو منبع حقیقی (خداوند متعال) سے متصل ہو ایسی موت کسی قسم کے زوال کا باعث نہیں ہے اور ایسی موت اسی وجہ سے خوف کا باعث نہیں ہے ضروری ہے کہ انسان خدا کی معرفت رکھتا ہو اور اسے معلوم ہو کہ بازگشت اور پلٹ کر جانا صرف خدا کی طرف ہے۔

عزت اور سیرت امام حسینؑ:

1-امام حسینؑ کی سیرت کے کچھ پہلو ایسے ملتے ہیں جن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ امام حسینؑ کی سیرت میں عزت کا کیا کردار ہے جیسا کہ امامؑ کی شہادت سے قبل آپ نے فرمایا کہ میں جب شہادت کے لئے جاؤں تو مجھے کم اہمیت لباس دیں تا کہ میں وہ پہن کر میدان جنگ کی طرف جاؤں جبکہ روایت میں ملتا ہے کہ آپؑ کو (تبّان) خاص لباس دیا گیا کہ وہ پہن کر جائیں تو آپ نے اس کو قبول نہیں کیا اور فرمایا: ﴿**لا ذاک لباس من ضربت علیه بالذلة**﴾ ''نہیں یہ لباس اس کا ہے جو ذلت سے دچار ہے۔''[۲۹]

2-جب ولید نے امام حسینؑ سے بیعت لینی چاہی اور آپؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کیا تو مروان بن حکم نے آپؑ کو قتل کی دھمکی دی تو آپؑ نے مروان سے یوں فرمایا: ''مجھے خداوند متعال کی قسم! اگر کوئی مجھے قتل کرنا چاہے اس سے پہلے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو میں اس کے خون سے زمین کو سیراب کر دوں گا (اے مروان) اگر تو چاہتا ہے کہ میری بات کی سچائی کو پائے تو یہ عمل کر کے دیکھ لو تمہیں اس کا جواب دے دوں گا۔''[۳۰]

اور پھر امام حسینؑ نے ولید سے کہا: ﴿**ایها الامیر! انا اهل ابیت النبوة ومعدن الرسالة ومختلف الملائکه وبنا فتح الله وبناختم ویزید رجل فاسق مشارب الخمر قاتل النفس المحترمه معلن بالفسق مثلی لایبایع لمثله**﴾

''اے امیر! میں اہل بیت رسالت کے معادن میں سے ہوں اور ہم ہی الملائکہ کے بار بار نزول کی جگہ ہیں اور خداوند متعال نے ہمارے ذریعے ہی ابتدا کی ہے اور ہم ہی پر اختتام کیا ہے اور یزید فاسق شخص، شراب خور اور نفس محترمہ کا قاتل ہے اور اعلانیہ طور پر فسق و فجور انجام دیتا ہے اور مجھ

جیسا یزید جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا۔''[۳۱]

3-جب محمد حنفیہ سے بات ہوئی تو آپ نے یزید کی بیعت کے بارے میں یوں فرمایا:﴿**یااخی! و الله لو لم یکن فی الدنیا ملجأ و لامأویً لمابایعت و الله یزید ابن معاویه ابداً**﴾ ''اے میرے بھائی! خدا کی قسم اگر روی زمین پر میرے لئے کوئی ٹھکانہ اور پناہ گاہ بھی باقی نہ رہے تب بھی میں یزید ابن معاویہ کی کبھی بھی بیعت نہیں کروں گا۔''[۳۲]

ان تمام الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے نزدیک یزید کی بیعت کرنا کتنا قابل نفرت کام تھا کہ جو آپ کسی حالت میں بھی انجام نہیں دے سکتے چاہے اس کے لئے آپ کے پاس روی زمین پر ایک ٹکڑا بھی باقی نہ رہے پس آپ موت کو سعادت سمجھتے تھے اور بیعت جیسے کام کو انتہائی برا اور گناہ سمجھتے تھے۔

4-امام حسینؑ کی جب ملاقات کوفہ کے راستے میں فرزدق سے ہوئی تو آپ نے فرزدق سے فرمایا:﴿**وانا اولیٰ من قام بنصرة دین الله و اعزاز شرعه و الجهاد فی سبیل الله لتکون کلمة الله هی العلیاء**﴾ ''میں سب سے اولیٰ اور بہتر ہوں کہ خدا کے دین کی نصرت کے لئے کھڑا ہو جاؤں اور شریعت کو عزت بخشنے کے لئے جہاد کروں اللہ کے راستے میں تا کہ کلمۃ اللہ ہی بلند ہو۔''[۳۳]

امام حسین علیہ السلام یزید کے خلاف قیام کو اپنی ذمہ داری سمجھ رہے ہیں اور اگر اس وقت کے تمام افراد کو دیکھا جائے تو تنہا حضرت امام حسینؑ ہیں کہ جو اس ذمہ داری کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ویسے بھی یہ قیام تمام عالم اسلام پر واجب تھا لیکن اس وجوب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فقط امام حسینؑ ہی آگے بڑھے اور اس کام کو انجام دیا۔

امام حسینؑ نے عاشور سے قبل اور روز عاشور بہت سارے اعمال انجام دیئے کہ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امامؑ عزت کے خواہاں تھے اور یزید کے تمام اعمال کو لوگوں کے سامنے بیان کیا اور نہ صرف یزید بلکہ یزیدی فوج کے ایک ایک فرد کے کرتوتوں کو لوگوں کے سامنے بیان کیا اور انھیں لوگوں

کے سامنے ذلیل کیا جیسا کہ فوج اشقیاء کے سامنے حجت کو تمام کرنے کے لئے عبیداللہ ابن زیاد کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿**الا ان الدعی ابن الدعی قدر کزبین اثنتین بین السلة و الذلة وھیھات منا الذلة. یأبی اللہ ذالک لناورسولہ و المومنون و حجورٌ طابت وطھرت وانوف حمیة ونفوس ابیةمن ان نؤثر طاعتہ اللئام علی مصارع الکرام. الا وانی نراحف بھذہ الاسرة مع قلة العدد و خذلان الناصر**﴾ ''آگاہ رہو زنازادہ ابن زنازادہ (ابن زیاد) نے مجھے دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کو کہا ہے یا تلوار نکال کر جنگ کے لئے آمادہ رہوں یا پھر ذلت کا لبادہ اوڑھ لوں (یزید کی بیعت کروں) لیکن ذلت مجھ سے بڑی دور ہے جبکہ خدا، رسولؐ خداؐ، مومن اور پاک دامن افراد ہم سے اس قسم کے کام کی توقع رکھتے کہ اطاعت کی ذلت کو قتل ہونے پر کریم اور بزرگوں کی طرح ترجیح نہ دیں جان لو اگرچہ میرے پاس مددگار انتہائی کم ہیں پھر بھی تم سے جنگ کروں گا۔''[۳۴] اور پھر امامؑ، فوج اشقیاء کو اپنی صفات بتاتے ہوئے ان اشعار کو بصورت رجز پڑھا:

انا ابن علی الطھر من آل ھاشم	**کفانی بھذا مفخراً حین افخر**
وجدی رسول اللہ اکرم من مضی	**ونحن سراج اللہ فی الارض نزھر**
وفاطمة ای من سلالة احمد	**وعمی یدعی ذو الجناحین جعفر**
وفینا کتاب اللہ انزل صادقاً	**وفینا الھُدیٰ و الوحی بالخیر یذکر**[۳۵]

''میں علیؑ مطہر جو خاندان ھاشم میں سے ہے ان کا بیٹا ہوں اور میرے لئے یہ افتخار جب میں فخر کروں کفایت کرتا ہوں، میرے جد حضرت رسول اکرمؐ بزرگ ترین افراد میں سے ہیں اور ہم خدا وند متعال کے چراغ اور نور ہیں کہ جو زمین پر اھل زمین کو منور کرتا ہے میری ماں حضرت فاطمۃ الزھراءؑ حضرت احمد مرسلؐ کی نسل ہیں اور میرے چچا جعفرؑ ہیں جن کو خداوند متعال نے پر عطا کئے تھے ہمارے خاندان میں خداوند متعال کی سچی کتاب نازل ہوئی اور ہمارا خاندان ہی ہدایت، وحی کا خاندان ہے جب کوئی ذکر کرے تو ان اسماء سے مشہور ہوتا ہے۔''

یہ وہ اعزاز ہیں جو امامؑ نے اپنے لئے ذکر کئے اور تمام عالم اسلام کو بتایا کہ ہم ہی معزز ترین افراد ہیں خداوند متعال کے نزدیک اور ہم ہی ہر صفت کے لحاظ سے اور خاندان کے لحاظ سے ہم سے پاکیزہ ترین خاندان وجود نہیں رکھتا۔اسی وجہ سے آپ نے دشمن کی ذلت کے پہلوؤں کو بھی ذکر کیا اور فرمایا کہ ﴿**ویلکم یاشیعة آل ابی سفیان ان لم یکن لکم دین و کنتم لایتخافون المعاد فکونوا احراراً فی دیناکم هذه وارجعوا الیٰ احسابکم ان کنتم عرباً کماتزعمون**﴾ ''ویل ہو تم پر اے آل ابوسفیان کے شیعو! اگر تمہارے پاس دین نہیں ہے اور تم معاد اور قیامت سے نہیں ڈرتے تو کم از کم اپنی دنیا میں آزاد رہو اور اپنے حسب نسب کی طرف پلٹ جاؤ اور تم عرب ہو جیسا کہ تمہارا گمان ہے۔''

☆☆☆☆

حوالہ جات

(۱) سموالمعنی فی سموالذات، ص ۱۰۵

(۲) تاریخ طبری، ج ۴، ص ۲۶۶۔ الکامل فی التاریخ، ج ۴، ص ۲۳۔

(۳) القرآن

(۴) المنجد، کلمہ عز

(۵) معجم مفردات الفاظ قرآن۔ راغب اصفہانی۔ چاپ بیروت۔

(۶) مفردات الفاظ قرآن۔ راغب اصفہانی۔ چاپ بیروت۔

(۷) لسان العرب۔ ابن منظور جلد ۹۔

(۸) سورۂ نساء/۱۳۹۔ (۹) سورۂ یونس/۶۵۔

(۱۰) سورۂ منافقون/۸۔ (۱۱) سورۂ فاطر/۱۵۔

(۱۲) نہج البلاغہ، خطبہ ۶۵۔

(۱۳) منتخب میزان الحکمۃ، محمدی ری شہری۔ بحار الانوار، ج ۷۸، حدیث ۶۷۔

(۱۴) خصائل شیخ صدوق، ص۴۲۰۔
(۱۵) خصائل شیخ صدوق، ص۲۲۲۔
(۱۶) نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۳۷۱۔
(۱۷) نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۱۱۳۔
(۱۸) منتخب میزان الحکمۃ، ص۳۴۶۔
(۱۹) بحار الانوار، ج۳۶، ص۳۸۴۔
(۲۰) کافی، محمد یعقوب کلینی، تصحیح و تعلیق علی اکبر غفاری، ج۵، ص۶۳۔
(۲۱) مفاتیح الجنان۔
(۲۲) موسوعۃ کلمات امام حسینؑ، ص۷۹۷۔ مفاتیح الجنان، دعای عرفہ۔
(۲۳) موسوعۃ کلمات امام حسینؑ، ص۷۹۸۔ مفاتیح الجنان، دعای عرفہ۔
(۲۴) موسوعۃ کلمات امام حسینؑ، ص۷۹۹۔ مفاتیح الجنان، دعای عرفہ۔
(۲۵) بحار الانوار، ج۲۴، ص۱۹۲۔
(۲۶) بحار الانوار، ج۲۴، ص۱۹۲۔ (۲۷) القرآن۔
(۲۸) موسوعۃ کلمات امام حسینؑ، ج۱۱، ص۶۰۱۔
(۲۹) بحار الانوار، ج۴۵، ص۵۴۔
(۳۰) کتاب المفتوح، ابو محمد احمد بن اثم کوفی، ج۵، ص۱۴۔
(۳۱) کتاب المفتوح، ابو محمد احمد بن اثم کوفی، ج۵، ص۱۴۔
(۳۲) کتاب المفتوح، ابو محمد احمد بن اثم کوفی، ج۵، ص۲۱۔
(۳۳) موسوعۃ کلمات امام حسینؑ، ص۳۳۶۔
(۳۴) لھوف، ص۱۲۳، ۱۲۴۔
(۳۵) بحار الانوار، ج۴۵، ص۴۹۔

کتابیات امام حسینؑ

سید محمد علی ترمذی

فن کتابیات(Biblio Graphy) کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام وخاص قارئین کی رسائی ان مآخذ تک کرادی جائے جو ان کے موضوع یا موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں علوم کی موجودہ تقسیم کے مطابق کتابیات لائبریری سائنس کے ایک جز ولاینفک ہے کیونکہ اس علم اور فن تحقیق کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے کتابیات کو کسی بھی موضوع کی تحقیق کی خشت اول قرار دے دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا تحقیق کا تو پہلا زینہ ہی ان منابع کو جاننا ہے جن سے متعلقہ موضوع پر مفید معلومات فراہم ہوسکتی ہیں اور ایسے منابع کا پتہ کتابیات ہی سے چلتا ہے۔

کئی علوم کی طرح کتابیات کا سنگ بنیاد بھی مسلمانوں ہی نے رکھا اور اس سلسلے میں ایسی شاندار روایات قائم کیں کہ آج بھی لائبریری سائنس کے بڑے بڑے مغربی ماہرین سراہتے ہوئے مسلمانوں کی بلند پایہ خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے نظر آتے ہیں اس ضمن میں ہونے والی مسلمانوں کی کاوشوں میں سے تین مصادر کا ذکر کردینا ہی کافی ہے ان میں ایک تو ''ابن الندیم'' ہے جس کی الفہرست اتنی صدیاں گذر جانے کے باوجود مستند ترین مصادر میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بعد حاجی خلیفہ کی ''کشف الظنون'' ہے اور اس عہد میں آغا بزرگ طہرانی کی ''الذریعہ الیٰ تصانیف الشیعہ'' ہے جس کو اب اضافوں کے ساتھ نئے سرے سے شائع کیا گیا ہے افسوس کہ مسلمانوں کی قائم کردہ یہ قابل قدر روایات زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکیں اور دیگر علوم کی طرح انھیں بھی اغیار لے گئے اور پھر بناسنوار کر ایک مکمل علم کے درجے تک پہنچادیا۔

زیر نظر مضمون میں امام عالی مقام حسین علیہ السلام کی زندگی اور تحریک کربلا کے حوالے سے لکھی جانے والی کتب کا جائزہ لیں گے۔ امام عالی مقام حسینؑ عالم اسلام کی ان شخصیات میں سے ایک ہیں جن کہ بارے میں سب سے زیادہ لکھا گیا گو کہ ان چند اوراق پر ان کا احاطہ کرنا ناممکن ہے مگر کوشش

کی گئی ہے کہ پڑھنے والا ابتدائی معلومات سے بہرہ مند ہو سکے سر دست میری نظر میں کتابیات امام حسینؑ پر تین حوالے موجود ہیں کہ جن سے رجوع کرنے سے موضوع کے متعلق سیر حاصل معلومات میسر آسکیں گئیں گو کہ مذکورہ مآخذ کسی طرح بھی مکمل آگاہی نہ دے سکیں گے مگر شائقین تحقیق وجستجو کے لئے زینہ ضرور فراہم کر سکتے ہیں۔

پہلا مجموعہ سید حسین عارف نقوی کا مرتب کردہ ''برصغیر کے امامیہ مصنفقین کی مطبوعہ تصانیف اور تراجم'' جسے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا ہے اس مجموعہ میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، سن اشاعت،

ناشر کا نام ومقام وغیرہ کے علاوہ چند سطروں میں کتاب کا خلاصہ یا عنوانات کہ جن کا تذکرہ اس کتاب میں ہوا درج ہے۔

دوسرا مجموعہ جو میرے پیش نظر ہے وہ دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان کی کراچی کی شائع کردہ ہے جسے سید علی شرف الدین موسوی نے تالیف کیا ہے اس کا سن اشاعت مارچ ۲۰۰۱ء ہے اس کا نام ''معجم کتب ومولفین حیات وقیام امام حسینؑ'' ہے اس میں عربی، فارسی اور اردو زبان میں لکھی جانے والی کتب کا تذکرہ ہے جس کی تعداد دو ہزار سات سو پچیس (2725) ہے اس میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، ناشر اور کتاب کتنے صفحات پر مشتمل ہے درج ہے کتاب کے آخر میں مولف نے بعض مصنفین اور مولفین کے مختصر حالات زندگی بھی تحریر کیے ہیں نیز تین سو باسٹھ مضامین کے حوالہ جات بھی درج ہیں

تیسرا مجموعہ کتابیات امام حسینؑ ہے جسے سید جمیل احمد رضوی سابقہ ڈپٹی چیف لائبریرین پنجاب یونیورسٹی لاہور نے مرتب کیا ہے اس میں پاکستان میں شائع ہونے والی کتب کا تعارف کروایا گیا ہے کیونکہ مولف خود لائبریری سائنس کے سینئر اساتذہ میں سے شمار ہوتے ہیں اس لئے اس مجموعہ کو متعلقہ علم کے اصول وقواعد کے مطابق مرتب کیا ہے۔

یہاں چند اہم کتب کا تعارف کروایا جا رہا ہے:

کتاب:**شہید انسانیت**

مصنف: سید العلماء سید علی نقی نقوی

سن اشاعت:2006ء

بار اشاعت: ہشتم

ناشر: امامیہ مشن پاکستان لاہور

اس کتاب کے مصنف برصغیر کی تاریخ تشیع میں نادر روزگار شخصیت تھے آپ کا شمار ہندو پاک ان جید و ممتاز علماء میں ہوتا ہے جو درجہ اجتہاد پر فائز تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں ''شعبہ دینیات'' کے ڈی این کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے امامیہ مشن کے بانی تھے تفسیر قرآن مجید کے علاوہ مختلف موضوعات پر کثیر کتب تحریر فرمائیں اس کے علاوہ موصوف اپنی طرز کے بہترین مقرر تھے آپ اپنی زندگی کے آخری ایام میں تین سال پاکستان تشریف لاتے رہے اور ایام عزا میں مجالس سے خطاب کرتے تھے بندۂ ناچیز کو لاہور میں موصوف کی مجالس سننے اور قریب سے زیارت کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔

یہ کتاب واقعہ کربلا کے تیرہ سو برس مکمل ہونے پر یعنی ۱۳۶۱ھ میں لکھی گئی اردو زبان میں لکھی جانے والی امام حسینؑ کی سیرت وسوانح کے موضوع پر ایک مستند ترین کتب میں سے ایک ہے یہ اھل زبان کے قلم سے نکلی ہوئی ایک تحریر ہے جس نے اسے مذید مقبول بنا دیا ہے اس کتاب کا مقدمہ علامہ سید محمد جعفر زیدی شہید، خطیب جامع مسجد اسلام پورہ نے تحریر کیا ہے اس کتاب می ں امام عالی مقام کے خاندانی پس منظر سے لے کر توابین اور بنی عباس کی حکومت کے قیام تک کے واقعات حالات اوران کا تجزیہ موجود ہے اس کتاب کے تینتالیس (43) باب ہیں اور آخر میں عالم انسانی کو اصلاح عمل اور اتباع اسوہ حسینی کی دعوت دی گئی ہے حاشیہ پر ضروری حوالہ جات درج ہیں جو کتاب کی تحقیقی حیثیت کو اجاگر کرتے ہیں نمونہ کے طور پر ایک مختصر سا پیرا قارئین کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے:

''حسینؑ اس وقت بھی حسینؑ ہی رہتے کہ جب آپ صرف اپنے تمام اصحاب واعزہ کے

ساتھ شہید ہو جاتے اور اپنے جہاد کو اپنی زندگی کے خاتمہ ہی پر ختم کرتے مگر اس وقت حسینؑ میدان جہاد میں اور بھی بلند نظر آئے جب آپ نے اپنی شہادت کے بعد کے لئے اس شہادت کے مقاصد کی اشاعت کا انتظام کی اپنے حرم اور چھوٹے بچوں کو ساتھ لا کر جن میں سے ہر ایک میں فرض شناسی اور حقیقت پروری اس طرح سرایت کئے ہوئے تھی کہ ابن زیاد کے دربار اور یزید کے قصر میں بھی پسماندگان میں سے کسی ایک متنفس نے اموی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا یعنی وہ بیعت کا انکار جس پر حسینؑ کا سر نیزہ پر پہنچ گیا اب بھی قائم تھا اور اب اس کے علمبردار سید سجادؑ، زینبؑ وکلثومؑ ہی نہیں بلکہ کمسن بچے، فاطمہ، سکینہ اور محمد باقرؑ بھی تھے۔''

کتاب: **پیشوائے شہیداں**

نام مصنف: سید رضا صدرؒ

مترجم: مولانا محمد عباس فتی

ناشر: امامیہ پبلی کیشنز لاہور

سال: ۲۰۰۱ء

بار اشاعت: سوم

فارسی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کی گئی سید رضا صدر کی کتاب پیشوائے شہیداں کتابیات امام حسینؑ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اس کتاب میں مصنف نے نہ تو تاریخ لکھی ہے نہ واقعہ نگاری سے براہ راست تعلق رکھا ہے بلکہ انھوں نے واقعات کے پردے میں مخفی محرکات اور پوشیدہ مطالب کا تجزیہ کیا ہے سید سجاد رضوی کے بقول جنہوں نے اس

کتاب کا مقدمہ لکھا ہے کہ'' لکھنے والے نے اپنی پوری ادبی تخلیقی طاقت کو اس کتاب کی تحریر میں صرف کیا ہے کہ ایک بار فارسی کتاب شروع کر دے تو چھوڑنے کی جی نہیں چاہتا.....ایسی کتاب اردو میں موجود نہیں اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ فارسی یا عربی میں بھی موجود نہیں راقم کی رائے یہ ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان کے کربلائی ادب میں ایک گراں

قدر اضافہ ہے۔مصنف عزاداری کی اہمیت پر تحریر کرتے ہیں:

''شہید کی عزاداری کرنا اس کی شہادت کو زندہ رکھنا ہے بنت علیؑ کی اسیری نے سید الشھداء کی شہادت کو دوام جاودان عطا کی ہے اگر پیشوائے شہدا کی سوگواری نہ ہوتی تو آج کوئی حسینؑ کا شناسا نہ ہوتا.....شہیدی عزاداری فرد اور معاشرے کو شہید شناس بنا دیتی ہے.....شہید کی عزاداری ظالم کے خلاف فطری نفرت کو برانگیختہ کرتی ہے.....آنسو راہ حسینؑ کی طرف دعوت (کا ذریعہ) ہیں (مگر) یہ دعوت اشک زبان وقلم کا ذریعہ نہیں بلکہ دل کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

نام کتاب: **امام پاک اور یزید پلید**

مصنف: مجدد مسلک اھل سنت علامہ محمد شفیع اوکاڑوی

سن اشاعت: ۱۹۹۰ء

بار اشاعت: چہارم

ناشر: جناء القرآن پبلی کیشنز لاہور

یہ اھل سنت کی جانب سے امام عالی مقام کی بارگاہ می ں ایک عقیدت کا اظہار ہے ''یزیدی فرقے'' کے پرچارک محمود احمد عباسی نے خلاف معاویہ ویزید نیز مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب خلافت اور ملوکیت پر تنقید بعنوان تبصرہ محمودی بر ہفوات مودودی (ان کے دو کتابوں کے جواب میں) اھل سنت کے خطیب، عالم اور مصنف علامہ محمد شفیع اوکاڑوی نے زیر نظر کتاب تحریر کی ہے اس میں مصنف نے جہاں یزیدی فرقے سے اظہار بیزاری کیا ہے وہاں امام حسینؑ کی عظمت، منزلت، کردار اور قیام کو حق بجانب قرار دیا ہے اھل بیت اطہارؑ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے موصوف نے قرآنی آیات، احادیث مبارک، تاریخی اور عقلی دلائل سے اپنے موقف کو پیش کیا ہے کتاب کے آخر میں مصنف تحریر کرتے ہیں:

''ان ارشادات مبارکہ کے مطابق ہی اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی محبت سرمایہ ایمان، ذریعہ

قرب خدا تعالیٰ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وسیلہ نجات ہے چنانچہ اکابر اہل سنت نے بلحاظ مدارج ان کے اسماء مبارکہ خطبہ جمعہ میں داخل فرمائے تاکہ ہر جمعہ کو برسر منبر اس عقیدہ کا اظہار و بیان ہوتا رہے اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی محبت وعقیدت مستحکم رہے۔لہذا جو ان کی ذات اقدس پر نکتہ چینی کرے اور ان کی طرف بغض وحسد، حب جاہ اور ہوس اقتدار کی نسبت کرے اور ان کو باغی، فسادی اور فتنہ پرور قرار دے اور قرآن وحدیث سے ثابت شدہ ان کے
فضائل ومناقب کو محض خیالی مناقب بتائے وہ بلاشبہ اھل سنت و جماعت سے خارج، گمراہ، بے دین اور جہنمی ہے۔''

یہاں تبرکاً چند کتب کے حوالہ جات درج کیے جاتے ہیں:

سخن عشق:

یہ شہید علامہ عارف حسین الحسینی کی مجالس عزا کا مجموعہ ہے جسے العارف اکیڈمی لاہور نے مرتب کیا ہے۔

نام کتاب: سخن عشق

مرتب وناشر: العارف اکیڈمی لاہور

بار اشاعت: اول

سن اشاعت: ۱۹۹۶ء

گفتار عاشورا:

یہ آیت اللہ محمود موسوی طالقانی، آیت اللہ شہید مرتضٰی مطہری، آیت اللہ محمد حسینی بہشتی اور ڈاکٹر محمد ابراہیم امینی کی پانچ تقاریر کا مجموعہ ہے ان تقاریر کے موضوعات یہ ہیں:

(۱) جہاد حسینی کے اسباب (۲) کامیاب جدوجہد (۳) جہاد وشہادت (۴) خطبہ اور منبر (دو تقاریر)

تدوین: رضا حسین رضوانی

ترجمہ: مستجاب احمد انصاری

ناشر: جامعہ تعلیمات اسلامی

عنوان عاشورا

یہ چھ مقالہ جات کا مجموعہ ہے جس میں آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر اور شہید آیت اللہ سید محمد حسین بہشتی کے مقالا جات بھی شامل ہیں یہ مقالہ جات ان موضوعات پر ہیں:

(۱) امت کے ہزیمت خوردہ اخلاق کی اصلاح (۲) شہادت حسینؑ ایک آگاہانہ اقدام

(۳) سید الشہداء کا کامیاب جہاد (۴) انقلاب کربلا ایک تاریخی جائزہ

(۵) عنوان عاشورہ (۶) میدان جنگ میں امام حسینؑ کے خطبات

نام کتاب: عنوان عاشورہ

ناشر: دار الثقافہ الاسلامیہ پاکستان کراچی

بار اشاعت: اول

سن اشاعت: ۱۴۲۲ھ

سعادۃ الدارین فی مقتل الحسینؑ:

یہ علامہ محمد حسین نجفی کی کتاب امام حسینؑ کے حالات وواقعات، خاندانی پس منظر اور کربلا کے واقعات وغیرہ پر ایک مفصل کتاب ہے جس میں مصنف نے قرآن، حدیث اور تاریخی حوالہ جات کو درج کرنے کے بعد اپنا موقف بیان بھی کیا ہے یہ اپنے حوالے سے ایک جامع کتاب ہے گو کہ مصنف کا انداز بیان اور زبان دلکش نہیں ہے بعض افراد نے مصنف کے خیالات سے اختلاف بھی کیا ہے۔

نام کتاب: سعادۃ الدارین فی مقتل الحسین

مصنف: علامہ محمد حسین نجفی

ناشر: مکتبہ السبطین سرگودھا

سن اشاعت: ۱۹۷۱ء

بار اشاعت: اول

ذکر حسینؑ:

یہ کتاب ممتاز قانون دان، اسلامی نظریاتی کونسل کے سابقہ رکن اور سابقہ وزیر قانون سید افضل حیدر ایڈوکیٹ

نے تحریر کی ہے اس میں امام عالی مقام کے حالات، جدوجہد پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اس میں یہ موضوعات ہیں مصلح، انقلابی یا باغی، آغوش رسالتؐ سے راہ عمل تک، ملوکیت کا عروج و زوال، سفر عشق، مکہ سے کربلا تک، اس میں میں شہداء کربلا کے مختصر حالات زندگی اور اھل بیتؑ کی شان قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔

نام کتاب: ذکر حسینؑ

مصنف: سید افضال حیدر ایڈوکیٹ

ناشر: دوست پبلی کیشنز

سال اشاعت: ۲۰۰۴ء

بار اشاعت: اول

حسین ابن علیؑ:

یہ کتاب بھی سید افضال حیدر ایڈوکیٹ نے تحریر کی ہے اس کتاب میں امام حسینؑ کے دور کے حالات اور امامؑ کے فریضہ پر بحث کی ہے موضوعات میں سے چند ایک یہ ہیں: امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ذبح عظیم اور فلسفہ شہادت، علی اور بنوامیہ، قیام حسینؑ کا پس منظر، کربلا، کوفہ اور شام، حضرت ابراہیم سے لے کر امام زمانہؑ تک کا منتخب شجرہ اور اہم افراد شجرہ کے حالات اس کتاب میں جہاں دیگر اردو، فارسی کتب سے مدد لی گئی ہے وہاں برجستہ اشعار کا سہارا بھی لیا گیا ہے مثلاً کتاب کے شروع میں شورش کاشمیری کا یہ شعر درج ہے:

؎ کربلا کا سیدھا سادا مختصر نکتہ ہے یہ　　　کوئی غاصب مومنوں کا بن نہیں سکتا امام

سیرت سیدالشہداء حضرت امام حسینؑ (دو جلدیں):

یہ کتاب فارسی زبان سے اردو زبان میں منتقل ہوئی ہے جس کی پہلی جلد میں ولادت امام عالی مقامؑ سے لے کر شہادت تک کے واقعات درج ہیں دوسری جلد میں شہدائے کربلا کے حالات اور کربلا کے بعد کے واقعات درج ہیں۔

نام کتاب: سیرت سیدالشہداء حضرت امام حسینؑ

مولف: عمادالدین اصفہانی عمادزادہ

مترجم: محمد حسین زیدی بارہوی

ناشر: امامیہ پبلی کیشنز لاہور

قرآن اور امام حسینؑ:

استاد محسن قرائتی نے قرآن اور امام حسینؑ کی خوبصورت تطبیق کی ہے نیز کربلا کی تفسیر، امام عالی مقامؑ کا موقف اور امامؑ نے جہاں جہاں قرآن پاک سے استنبد اد کیا ہے، تذکرہ کیا ہے شہادت، جہاد، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور نماز کی اہمیت کو قرآن کی روشنی میں کربلا کے میدان جلوہ گر ہوتے دکھایا گیا ہے ناشر نے کتاب کے شروع میں آقائے قرائتی کا ایک خط بھی شامل کیا ہے جس میں مولف نے حوزہ علمیہ کے زعماء سے قرآن مجید سے مزید رجوع کرنے کی درخواست کی ہے یہ کتاب اپنے حوالے سے کتابیات امام حسینؑ میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

نام کتاب: قرآن اور امام حسینؑ

مصنف: استاد محسن قرائتی

مترجم: سید محمد علی ترمذی

ناشر: البیان لاہور

سن اشاعت: ۲۰۰۷ء

نوٹ: قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ موضوع پر کیونکہ بہت زیادہ کتب موجود ہیں اس لئے چند کتب کا انتخاب کیا گیا ہے ورنہ زندگی کم ہے اور امام حسینؑ پر کتب بہت زیادہ ہیں۔